

اقبال

اور

شکرین صدمت

مصنف

پروفیسر محمد فرمان ایم۔ اے



DATA ENTERED

(جملہ حقوق بحق محمد زبیر سید محفوظ)

کی محمد سے وفاتوں نے تو ہم تیرے ہیں

11/1/12

محمد نور بشید خاں بنجر نے  
پنجاب الیکٹریک لیسین پرانا اور اجلا پوری گجرات سے چھپوا کر  
مکتبہ مجددیہ نور پور شرقی  
گجرات سے شائع کیا

تعداد \_\_\_\_\_ ایک ہزار  
بار اول \_\_\_\_\_ ۱۹۶۳

قیمت

فی جلد عمرہ ادیشن \_\_\_\_\_ تین روپیہ  
عام \_\_\_\_\_ ڈھائی روپیہ

مکتبہ مجددیہ نور پور شرقی گجرات



Ph 29.4.69

Mahdabun Jaleed

Rn 2.50

اشک

شیخ طریقت جناب کرم الہی نقشبندی مجددی

۳

۴



# فہرست مضامین

۲۲	حدیث کے ایک اشارے	۹	دیباچہ
۲۲	کی اہمیت	۱۲	اقبال کے انگریزی خطبات
۲۲	علامہ کا صحیح مفہوم	۱۹	۵ ماہ پر دنیس گرگولڈ نیسہر کی تنقید حدیث
۲۵	ایک سوال	۲۱	امام ابو حنیفہ کا اجتہاد کی مقام
۲۵	(حبیبنا کتاب اللہ سے متعلق)	۲۳	امام اعظم پر الزام
۲۶	رحلت کے وقت حضور	۲۷	عرف اور تشریح
۲۶	کا کاغذ طلب کرنا	۳۰	حدیث کے متعلق اقبال کا نظریہ
۲۹	اندازہ گفتگو	۳۲	زندگی کے حالات اور احکام کا تعلق
۵۰	سزہ	۳۳	مسادات مرد و زن
۵۳	زنا	۳۵	قانون وراثت
۵۹	شراب	۳۷	قانون وراثت کا بغور مطالعہ
۵۹	سود	۴۱	نزکوں کی سیداری
۶۰	زندگی کے مثبت حالات اور قانون سازی	۴۳	وضاحت (علامہ کے مسلک کی)



- ۱۱۵ منکرین کے مسلک پر تنقید
- ۱۱۷ { مولوی حسنت علی (منکر حدیث) اور آذان
- ۱۲۵ منکرین حدیث پر تنقید
- ۱۲۷ { تعجب (مسلمانوں کے ہاں آذان کے الفاظ میں اختلاف)
- ۱۲۸ اذان میں کوئی اختلاف نہیں
- ۱۳۰ بہتان از اہل قرآن (منکرین حدیث)
- ۱۳۵ جواب از اہل حدیث
- ۱۳۹ امام بخاری پر ایک الزام کا جواب
- ۱۴۱ منکرین حدیث کی نماز
- ۱۴۵ یلاغ (منکرین حدیث کا رسالہ) رجوع بمطلب
- ۱۴۸ { انکار حدیث کی پہلی آواز
- ۱۴۹ مولوی عبداللہ چکڑالوی اور نماز
- ۱۵۵ { منکرین حدیث کا تیسرا فرقہ اور نماز
- ۶۵ کیا احکام دینی ہیں
- ۶۶ کلمہ طیبہ
- ۶۶ نماز
- ۶۸ حدیث پر حملہ اور اسکی برافعت
- ۷۱ پرچہ اول (مجانب منکر حدیث)
- ۸۱ { جواب پرچہ اول (ایک مصدق حدیث کی طرف سے)
- ۹۰ اہل قرآن اور حدیث
- ۹۲ { اصلاح نماز (مجانب منکرین حدیث)
- ۹۶ اہل حدیث (منکرین پر تنقید)
- ۹۸ { امرتسر کی اہل قرآن جماعت میں برہہ و ازم
- ۹۹ امرتسر اہل قرآن (منکرین حدیث)
- ۱۰۳ حقیقت نماز (منکرین کے ہاں)
- ۱۰۴ مسئلہ قبلہ
- ۱۰۹ اہل قرآن (منکرین حدیث) اور آذان



- ۲۱۳۷ انام احمد بن حنبل
- ۲۱۵ { صحیحین میں اختلاف  
کی نوعیت
- ۲۱۷ نیاز فتحپوری کے عقیدے
- ۲۲۳ طلوع اسلام کا مساک
- ۲۲۷ اس مساک کی اصیبت
- ۲۳۱ { منکرین حدیث کے امام  
کے الہام کا انجام
- ۲۳۵ { منکرین حدیث اور  
انکار رسالت
- ۲۳۶ منکرین حدیث سے چند سوالات

- ۱۷۸ قرآنی نماز پر تشریح حدیث
- ۱۸۶ { منکرین حدیث کی نمازیں اور  
ان میں یاہمی اختلاف
- ۱۸۹ { منکرین حدیث اور اہل حدیث  
کی نزاع میں نتیجہ
- ۱۹۸ اہل قرآن کی حرکت مذہبی
- ۱۹۹ { عبدالرشک چکڑ الہی صاحب  
اور شہت علی صاحب
- ۲۰۱ قرآن کے اجمال اور تفصیل کی بحث
- ۲۰۶ { نیاز فتحپوری (ایک منکر حدیث)  
کی غلط بیانی



## الفتح الابواب

پاکستان اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا ہے۔ اس مملکت خدا داد کا مالک اللہ ہے۔ وہی اس کا حافظ اور وہی اس کے انتظام کا ضامن ہے۔ پاکستان کے آزاد شہریوں کی ذمہ داریاں نہایت غیر معمولی ہیں۔ ان میں نہایت اہم ذمہ داری اس مملکت کے لیے اسلامی آئین کی ترویج اور ترمیم ہے۔ جمہور مسلمانوں کے نزدیک کتاب مبین (قرآن) کے بعد سنت رسول امین قانون کا ضروری اور لاپرواہی ماخذ ہے۔

بدقسمتی سے اس ملک میں سنت کے خلاف ایک مہم برسر کار ہے۔ اس مہم کے سربراہ علامہ اقبال مرحوم کے مداح ہیں اور اپنے افکار کو ..... ان کے افکار کی تشریح کر دانتے ہیں۔ ان بزرگواروں کے انداز فکر کو واضح کرنے کے لیے اقبال اور منکمبین حدیث کے زیر عنوان یہ مقالہ ضبط تحریر میں لایا گیا ہے اور یہ کوشش کی گئی ہے



کہ علامہ مرحوم کا صحیح مسلک واضح ہو اور ان کے "مریدوں" کی تصویر  
 کے صحیح خدو خال عوام کے سامنے آسکیں۔ تاکہ یہ ملک جس مقصد کے  
 لیے وجود میں آیا تھا اس کے پورا ہونے میں غلط قسم کے افکار و  
 تصورات سدراہ نہ بن سکیں۔

---



## ویساچہ

’وگر از سرگرم قصہ زلف پریشال را‘

جب کوئی قوم معاشی اور سیاسی طور پر سر بلند نہیں رہتی تو اس کے  
افکار پر بھی لامحالہ اس زمانے کی برسر اقتدار اقوام کے خیالات و تصورات  
اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ زیر دست قومیں اس زمانے میں جو نقصانات  
اٹھاتی ہیں ان میں یہ ذہنی افتاد اور بے چارگی والا نقصان ان کے مستقبل  
کے لیے اور زندہ افکار کے لیے نہایت خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔  
یورپ کی بالادستی نے ہمیں ذہنی طور پر جو کچھ دیا ہے، اس سے کہیں  
زیادہ ہمارے ذہنوں کو اس نے لپٹی اور پڑا مردگی سے دو چار  
کر کے مفکرین کو دیا ہے۔ ہمارے کالجوں کے نوجوان مغربی نائنوں  
کے پرستار اور ان کے زور قلم کے مدارج ہوتے ہیں۔ مغربی عالموں  
کی رائے ان کے نزدیک وحی سے کمتر نہیں ہوتی اور وہ اس مرض  
کے بری طرح شکار ہو کر اپنے ہم وطن اہل علم اور مشرقی علماء کے



مبلغ علم کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک کا نظام تعلیم مغربی افکار کی گود میں سر دھرنے کو ہمیشہ سے پسند کرتا آیا ہے۔ اس کے لیے مغربی لوریاں نہایت دلپذیر ہیں ان میں مٹھاس بھی ہے اور آزادی بھی۔

شاید مغربی عینک لگا کر اپنے گھر کی سیر کرنے  
**مغرب پسندی** کا نتیجہ تھا کہ گذشتہ نو برسوں اسلامیات کے ایک

طالب علم نے جو بی۔ اے کے آخری سال میں تھا راقم سے یہ سوال کیا کہ "قرآن کی حفاظت تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، لہذا یہ کتاب زبرد اور زبرد کی ورستی کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کے برعکس احادیث کے مجموعوں کی صحت کی کیا ضمانت ہے؟" راقم نے اس سوال کا مدلل اور مفصل جواب تو دے دیا، لیکن اس پر خردوار کی تسلی نہ ہو سکی۔ وہ لاہور کے ایک موقر جریدہ کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس جریدہ میں جو افکار ہوتے وہ انہیں بار بار پڑھتا، خاص کر علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ اس رسالہ کے مدیر کو جو عقیدت تھی وہ اس پر خردوار کو بھی متاثر کیے ہوئے تھی۔ لہذا کوئی دلیل کوئی مباحثہ اس کی تشفی کے لیے سود مند نہیں تھا۔

اس بحث کے بعد راقم کے دل میں اس موضوع پر قلم اٹھانے کی



خواہش زیادہ تیز ہو گئی (یہ خواہش پہلے سے موجود تھی لیکن اس میں شدت پیدا کرنے کا سہرا اسی بر خوروار کے سر ہے)۔

**علامہ اقبال** | پاکستان کی سیاسی اور ذہنی تاریخ لکھنے والا علامہ اقبال کو ہمیشہ سرفہرست جگہ دے گا۔

انہوں نے بر عظیم ہندو پاک کے مسلمانوں کو آزادی کا پیغام دیا۔ انہیں خودداری کا احساس دلایا۔ مغرب کی ذہنی غلامی کی خامیاں واضح کیں۔ ناقہ بے زمام کو سوئے قطار سے جانے کی جدوجہد کی۔ انہوں نے اپنی اور اہل اسلام کی منزل حرم محترم کو قرار دیا۔ انہوں نے رومی کی طرح حرم میں اذان دی۔ فتنہ عصر حاضر کے قلع قمع کے لیے ان سے جو بن آیا، کیا۔ ان کے قلم نے جو جواہر پارے پیدا کیے۔ ان کی قدر و قیمت کما حقہ نہیں ہو سکی۔ ان کے افکار کی تشریح و توضیح کی ضرورت پوری نہیں ہو سکی۔ انہوں نے فرمایا تھا

میرے حلقہ سخن میں ابھی زیر تربیت ہیں

وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ در رسم بادشاہی

اپنے حلقہ اثر میں انہیں اپنے مریدوں کے جوش اور دلولہ سے

ایسا ہی محسوس ہوا ہوگا، نگران کی وفات کے بعد ان کے بعض پیروکاروں نے

انکے افکار کی صورت کو حتی الامکان مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت سی



عظمت باتیں علامہ مرحوم کے نام منسوب کر دی گئی ہیں جن سے ان کے مسلک کو نقصان پہنچا ہے۔

علامہ مرحوم نے اپنے خطبات میں اسلام اور الہیات سے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ وہ عظیم اور مفید ہونے کے باوجود مذہبی افکار ہیں صرف آخر نہیں ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کے دیباچے میں اس امر کی دلیل صراحت فرمائی ہے۔

”..... یائیں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ خود فکری میں قطعیت کوئی چیز نہیں جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور، اور شاہد ان نظریوں سے جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہر حال یہ ہے کہ فکر انسانی کے نشوونما پر باحتیاط نظر رکھیں۔ اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں“ (خاتمہ دیباچہ)

ان خطبات کا دائرہ نہایت وسیع اور عظیم ہے۔ ان میں ان مسائل سے متعلق بحث ہے جو اسلامی دنیا کے لیے آج زندگی اور موت کے مسائل ہیں مثلاً اجتہاد کے بارے میں جو نظریات پیش کیے گئے ہیں



وہ قابل مطالعہ اور نہایت وسیع ہیں، اسی خطبے میں قانون سازی سے بحث کرتے ہوئے اُنھوں نے قرآن کو ماخذ قانون ماننے کے بعد احادیث کا ذکر کیا ہے اور اُن کی افادیت پر اپنا نقطہ نظر بتایا ہے بد قسمتی سے علامہ مرحوم سے اس مقام پر چند ایسی فروگزاشتیں ہو گئی ہیں جن پر اُن کے "مریدوں" نے ایک حصار تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ مرحوم کا مقام مسئلہ اجتہاد کو سمجھنے میں بہت بلند ہے، ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۹ء میں لاہور میں جو اسلامی مجلس مذاکرہ ہوئی تھی اس میں اس موضوع سے متعلق بھی چند مقالے پڑھے گئے تھے اس مجلس کے تمام مقالے پڑھنے کے بعد ایمان داری سے یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ جس بیج سے علامہ نے مسئلہ کو اٹھایا ہے اور جس طرح ضرورت اجتہاد پر اُنھوں نے زور دیا ہے۔ محولہ بالا مجلس مذاکرہ کے علماء سے بات ویسے نہیں بن سکی ہے، بایں ہمہ علامہ سے اس خطبے میں جو فروگزاشتیں ہوئی ہیں، اُن کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے، ہم سرِ دست صرف اس مقام سے بحث کریں گے جو احادیث کے متعلق ہے۔

غازی مدبرارہ

۳ محرم ۱۳۸۲ھ

۶ جون ۱۹۶۲ء



# احادیث رسول کریم

## اسلام میں قانون سازی

علامہ قرآن کو اسلامی قانون سازی میں اولین ماخذ تسلیم کرنے کے بعد اور اس کے اندر جو روح و روحاں ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے، احادیث پر یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

۱۰ اسلامی قانون کا دوسرا بنیادی ماخذ احادیث رسول اللہ ﷺ ہیں جو ماضی اور حال ہر زمانے میں بڑی بڑی شدید بحثوں کا موضوع رہیں۔ عہدِ حاضر کے ناقدین میں سے پروفیسر گولڈن ٹیسمر نے تو ان قوانین کی رو سے جن کا تعلق تاریخی تنقید سے ہے، احادیث کے بارے میں بڑے تفصیل سے کام لیا ہے اور اس کا کہنا یہ ہے کہ بحقیقت

مجموعی ہمیں ان کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانا چاہیے۔ ایسے ہی ایک دوسرے مغربی اہل قلم نے اول تو صحت و عدم صحت حدیث کے ان طریقوں پر نظر ڈالتے ہوئے جو مسلمانوں میں رائج ہیں اور پھر یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ نظری اعتبار سے ان میں کہاں کہاں غلطیوں کا امکان ہے،



وسرچ ذیلی نتیجہ قائم کیا ہے :

لیکن اس بحث کے خاتمے پر یہ کہنا بھی لازم آتا ہے کہ ہم نے اوپر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا تعلق صرف نظری امکانات سے ہے نہ کہ یہ سوال کہ ان امکانات نے فی الواقعہ کہاں تک ایک عملی صورت اختیار کی سو اس کا جواب اس سوال سے وابستہ ہے کہ اس وقت کے احوال و ظروف نے کہاں تک ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دلائی۔ اب اگر سچ پوچھا جائے تو اس قسم کے احوال و ظروف نسبتاً نفاذ تھے۔ اور اس لیے سنت کا بہت تھوڑا حصہ ان سے متاثر ہوا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں جو مجموعہ آئے احادیث معتبر ٹھہرائے جاتے ہیں ان کا زائد حصہ

فی الواقعہ اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشوونما کی حقیقی تاریخ ہے :

لیکن جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے ہمیں چاہیے کہ ان احادیث کو جن کی حیثیت سے اس قانونی ہے ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر اول الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہوگا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے رسم و رواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا یا جس میں حضور رسالت تا ب صلعم نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی اس قدر حصہ موجود ہے لیکن یہ وہ



حقیقت ہے جس کا انکشاف مشکل سے ہو سکے گا کیونکہ علماء متقدمین  
 شاذ ہی اس رسم و رواج (عرف) کی طرف اشارہ کرتے ہیں ہمیں تو  
 شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم و رواج کو جوں کا قول چھوڑ دیا گیا،  
 خواہ حضور رسالت ناب صلعم نے اس کی بالصراحت منظوری دی  
 یا خاموشی اختیار فرمائی۔ اس پر کیا پھر محرم کہیں اور ہر زمانے میں عمل  
 کرنا مقصود تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز  
 بحث اٹھائی ہے ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں، انبیا کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ  
 وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اس قوم کے رسم و رواج اور  
 عادات و خصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے لیکن جس نبی  
 کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لیے مختلف  
 اصول نازل کیے جائیں گے نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی اپنی ضروریات  
 کے لیے الگ الگ اصول و عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔

وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل  
 میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے لیکن ایسا کرنے میں وہ اگر چہ نہیں  
 اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ  
 میں کار فرما ہیں پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقع پر عمل ان کا اطلاق اپنی



اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لیے مخصوص ہوں گے۔ پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلاؤں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابو حنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ انھوں نے اصول استحسان یعنی "فقہی تہیج" کا اصول قائم کیا۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعاً موجود ہیں باحتیاط ملاحظہ کریں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس فقہ اسلامی کے ماخذ کے بارے میں ان کا رویہ کیا تھا۔ رہا یہ کہنا کہ امام موصوف نے احادیث سے اس لیے اعتنا نہیں کیا کہ ان کے زمانے میں کوئی مجموعہ احادیث موجود نہیں تھا۔ سو اس سلسلے میں اول تو یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس زمانے میں احادیث کی تدوین نہیں ہوئی تھی کیونکہ عبدالملک اور زہری کے مجموعے امام موصوف کی وفات سے کم از کم بیس برس پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ ثانیاً اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ امام موصوف ان مجموعوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے، یا یہ کہ ان میں فقہی احادیث موجود



نہیں تھیں۔ جب بھی وہ ضروری سمجھتے تو امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ  
 کی طرح خود اپنا مجموعہ احادیث تیار کر سکتے تھے۔ لہذا بحیثیت جمعی  
 دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث  
 کے بارے میں جو روش اختیار کی سر تا پا جائز اور درست تھی۔ اندریں  
 صورت اگر آزادی اجتہاد کی وہ تحریک جو اس وقت دنیا سے اسلام  
 میں پھیل رہی ہے۔ احادیث کو بلا ترح و تقید قانون کا ماخذ تسلیم  
 کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس سے اہل سنت و الجماعت کے ایک  
 امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ سب سے  
 بڑی خدمت جو محدثین نے شریعت اسلامیہ کی سرانجام دی وہ  
 یہ ہے کہ انھوں نے مجرور و غرور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کی  
 بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور  
 دیا۔ لہذا احادیث کا مطالعہ اگر اور زیادہ گہری نظر سے کیا جائے،  
 اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے  
 ماتحت آنحضرت صلعم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی۔ تو اس سے  
 ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہوگی جو  
 قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں۔ پھر یہ ان اصولوں  
 کی حیاتی قدر و قیمت ہی کا پورا پورا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنی



فقہ کے بنیادی ماخذ کی از سر نو تعبیر اور ترجمانی کر سکتے ہیں۔  
یہ اقتباس بڑی وقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیے جانے کے قابل  
ہے۔ بعدِ حاضر کے ایک ناقدِ حدیث پروفیسر گولڈ ٹسیر کا یہ خیال کہ  
بحیثیت مجموعی ہمیں ان کو ناقابلِ اعتبار ٹھہرانا چاہیے، اور اس پر  
علامہ اقبالؒ کا سکوت اور ایک طرح کا اطمینان یہ شہید پیدا کرتا ہے کہ  
علامہ مرحومؒ کو پروفیسر موصوف کی رائے سے اختلاف نہیں ہے۔  
دوسرے ناقد کی رائے میں اتنی گنجائش نکلتی ہے کہ احادیث کا بیشتر  
حصہ اُس وقت کے احوال سے متاثر ہونے سے بچ رہا ہے۔ گویا  
فی الواقعہ اسلام کے ظہور اور ابتدائی نشوونما کی تاریخ ہے، اس کے  
بعد قانونی حیثیت والی احادیث کے ضمن میں مروجہ رسومات و عادات  
اطوار و عرف کے پیش نظر شارعِ اسلام علیہ السلام نے جن روایات  
پر سکوت اختیار فرمایا ہے اور جن میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہیں رکھی ہے  
ان عادات و عرف کے بارے میں یہ خیال کہ معلوم نہیں ایسا سکوت  
ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل ہے یا محض اس وقت کے لیے، نیز  
اسلامی تعزیرات کا عالمگیر ہونے کے باوجود عرب قوم کے حالات  
سے متعلق ہونا۔ اور یہ شک کہ چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں



اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لیے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ احادیث کی عملی حیثیت پر سخت اثر انداز ہوتا ہے جب علامہ اپنی اس رائے کو امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مزاج اور اقتدا و طبع کے مطابق قرار دیتے ہوئے ذیل کی سطور پر آتے ہیں تو احادیث کا ماخذ قانون ہونا نہایت درجہ مشتبہ اور غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہؒ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔۔۔۔۔ لہذا بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو میری رائے میں امام موصوف نے فقہی احادیث کے بارے میں جو روش اختیار کی سرتاپا جائز اور درست تھی، گویا احادیث سے (فقہی معاملات میں) بے نیازی کوئی نقصان وہ طریق فکر نہیں ہے۔ علامہ مرحوم آزادی اجتہاد کی جدید تحریک (جو ترکی میں اپنا رنگ دکھائی تھی) کے انداز فکر کو یعنی احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہونے کو امام موصوفؒ کی ایک طرح کی پیروی قرار دیتے ہیں۔ جب ایک قاری ان کی اس تنقید پر پہنچتا ہے تو اس کے دل سے احادیث کی افادی حیثیت اور قانونی عظمت جاتی رہتی ہے۔ اس اقتباس کا آخری حصہ نہایت اور جہاں اہم اور فی الواقعہ علامہ مرحومؒ کے ان خیالات کا محور ہے جو وہ احادیث کی قانونی حیثیت کے بارے میں



رکھتے تھے۔ ہم اس حصے کی تنقید و توضیح سے پہلے ماسبق اہم حصوں کو زیر بحث لاتے ہیں۔

ریاں سائے  
**امام ابو حنیفہ کا اجتہادی مقام** امام ابو حنیفہ کے متعلق ابن خلدون نے نہ معلوم کس سند پر یہ بات

لکھی تھی کہ حدیث قبول کرنے میں ابو حنیفہ اتنے متشدد تھے کہ ان کے نزدیک سترہ سے زیادہ حدیثیں صحیح نہ تھیں۔ یہ بات چلتے چلتے لوگوں میں اس طرح مشہور ہوئی کہ امام ابو حنیفہ کو صرف سترہ حدیثوں کا علم تھا۔ یا یہ کہ انھوں نے صرف سترہ حدیثوں سے مسائل اخذ کیے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل ایک خلاف واقعہ افسانہ ہے۔ آج امام ابو حنیفہ کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسف کی مرتب کردہ کتاب الآثار شائع شدہ موجود ہے جس میں انھوں نے اپنے استاد کی روایت کو ایک ہزار احادیث جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ امام کے دوسرے دو نامور شاگردوں امام محمد اور امام حسن بن زیاد اللؤلؤی نے اور امام کے صاحبزادے حماد بن ابی حنیفہ نے بھی ان کی روایت کو احادیث کے مجموعے مرتب کیے تھے۔ پھر مسلسل کئی صدیوں تک بکثرت علماء ان کی روایات کو مسند امام ابی حنیفہ کے نام سے جمع کرتے رہے۔ ان میں سے پندرہ مسانید کا ایک بجامع نسخہ قاضی القضاة محمد بن محمود



الخوارزمی نے "جامع مسانید امام الاعظم" کے نام سے مرتب کیا جسے  
 دائرة المعارف حیدرآباد نے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں  
 اس دعوے کی تردید قاطع ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ صرف سترہ حدیثیں،  
 جانتے تھے۔ یا انھوں نے صرف سترہ حدیثوں سے استدلال کر کے  
 فقہی مسائل نکالے ہیں۔ علم حدیث میں امام کے استادوں کی تعداد  
 (جن سے انھوں نے روایات لی ہیں) چار ہزار تک پہنچتی ہے۔ ان  
 کا شمار اکابر حفاظ حدیث میں کیا گیا ہے۔ ان کی مسانید جمع کرنے  
 والوں میں دارقطنی، ابن شہابین اور ابن عقیل جیسے نامور علماء حدیث  
 شامل ہیں، کوئی شخص فقہ حنفی کی معتبر کتابوں میں سے اگر صرف امام  
 طحاوی کی شرح "معانی الآثار" ابو بکر حصص کی "احکام القرآن"  
 اور امام نسائی کی "المبسوط" ہی کو دیکھ لے تو اسے یہ غلط فہمی کبھی بھی  
 لاحق نہ ہو، کہ امام ابوحنیفہ نے احادیث سے بے نیاز ہو کر صرف  
 قیاس اور قرآن پر اپنی فقہ کی بنیاد رکھی تھی۔

۱۱۷۱۲

پھر حدیث سے استناد کے معاملہ میں امام ابوحنیفہؒ کا جو مسلک  
 تھا اسے انھوں نے خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "مجھے جب کوئی  
 حکم خدا کی کتاب میں مل جاتا ہے تو میں اس کو تھام لیتا ہوں، اور  
 جب اس میں نہیں ملتا تو رسول اللہؐ کی سنت اور آپ کے صحیح آثار



کو لیتا ہوں جو ثقہ لوگوں کے ہاں ثقہ لوگوں کے واسطے سے معروف  
ہیں پھر جب نہ کتاب اللہ میں حکم ملتا ہے، نہ سنت رسول اللہ میں تو  
ہیں اصحاب رسول کے قول یعنی ان کے اجماع کی پیروی کرتا ہوں  
اور ان کے اختلاف کی صورت میں جس صحابی کا قول چاہتا ہوں قول  
کرتا ہوں اور جس کا چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ مگر ان سب کے اقوال  
سے باہر جا کر کسی کا قول نہیں لیتا۔ رہے دوسرے لوگ تو جس طرح  
اجتہاد کا حق انہیں ہے مجھے بھی ہے۔

امام ابو حنیفہ کے سامنے ایک مرتبہ ان پر یہ  
امام اعظم پر الزام الزام لگایا گیا کہ وہ قیاس کو نص پر ترجیح دیتے  
ہیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا بخدا اس شخص نے جھوٹ کہا اور ہم پر  
افتر کیا جس نے کہا کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں۔ بھلا نص کے  
بعد بھی قیاس کی کوئی حاجت رہتی ہے۔

خلیفہ منصور نے ایک مرتبہ امام کو لکھا کہ میں نے سنا ہے آپ  
قیاس کو حدیث پر مقدم رکھتے ہیں جواب میں انہوں نے لکھا:

۱۔ تاریخ بغداد للخطیب جلد ۱۳ ص ۳۶۸ مناقب امام اعظم۔

۲۔ لموفق الکی جلد ۱، ص ۷۹ وغیرہ۔

۳۔ کتاب المیزان للشعرانی جلد ۱، ص ۷۱۔



”امیر المؤمنین جو بات آپ تک پہنچی وہ صحیح نہیں ہے میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر، پھر ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں پر، پھر باقی صحابہؓ کے فیصلوں پر، البتہ جب صحابہ میں اختلاف ہو تو قیاس کرتا ہوں“۔

علامہ ابن حزم نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ: ”تمام اصحاب ابی حنیفہ اس بات پر متفق ہیں کہ ابو حنیفہ کا مذہب یہ تھا کہ ضعیف حد بھی مل جائے تو اس کے مقابلے میں قیاس اور رائے کو چھوڑ دیا جائے“ ۱۲۵

امام اعظمؒ کے طریق اجتہاد کے بارے میں غلط روایات کی شہرت کی وجہ سے علامہ اقبال نے مندرجہ بالا رائے ان کے طریق کار کے متعلق قائم کی ہے اور ان کی اس رائے کی روشنی میں دوسرے اہل علم کا بھی یہی مسک متعین ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک فاضل حج کا ارشاد ہے:

۱۔ کتاب المیزان للشعرانی ص ۶۲۔

۲۔ مناقب امام ابو حنیفہ وصاحبین للذہبی۔ ص ۱۱۰

۳۔ اقتباس از ترجمان القرآن جلد ۵۶، عدد ۶، منصب رسالت نمبر ص ۳۱۴ - ۳۱۹۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرہ النعمان شبلی نعمانی



”مگر ابوحنیفہ نے جو سترہ میں پیدا ہوئے اور جن کا انتقال سترہ سال بعد ہوا تقریباً سترہ اٹھارہ حدیثیں ان مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو ان کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رسول اللہ کے زمانہ سے اس قدر قریب نہ تھے جس قدر پہلے چار خلفائے انھوں نے تمام فیصلوں کی بنا قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے پیچھے ان محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ان ہدایات کے موجب تھے۔ وہ استدلال و استنباط کی بڑی قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول اور نظریات مرتب کیے۔ اگر ابوحنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تفسیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں کریں تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

اس ارشاد کے مطالعہ کے بعد اقبال کی محولہ بالا رائے دوبارہ دیکھی جائے۔ مثلاً ”شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیر حیثیت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ احادیث سے اعتنا نہیں کیا۔ انھوں نے اصول استنباط یعنی فقہی تزییح کا اصول قائم کیا

۱۔ اقتباس از صفحہ ۱۶۳۔ رسالہ ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر۔



جس کا تقاضا یہ ہے کہ قانونی غور و فکر میں ہم ان احوال و ظروف کا بھی جو واقعاً موجود ہیں بااحتیاط مطالعہ کریں..... اندریں حالات اگر آزادی اجتناب کی وہ تحریک جو اس وقت دنیا سے اسلام میں پھیل رہی ہے۔ احادیث کو بلا جرح و تنقید قانون کا ماخذ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس سے اہل سنت و الجماعت کے ایک امام الائمہ ہی کی پیروی مقصود ہے؛

یہ تحریک ترکی میں پھیل رہی تھی اس کے خطرناک نتائج کا جب علامہ نے بعد میں بغور مطالعہ کیا۔ تو وہ اس تحریک سے سخت بیزار ہو گئے اور انھوں نے جاوید نامہ میں اس تحریک کے علمبردار مصطفیٰ کمال پاشا پر کڑی تنقید کی:

مصطفیٰ کو از تجردی سرود  
گفت ہر نقش کہن باید زود

تو نہ گرو کعبہ را ساز حیات  
گوزا فرنگ آیدش لات و منات

تذکوں نے بھی فرنگ سے لات و منات درآمد کیے تھے اور آج ہم بھی مغربی اقوام کی بالادستی سے متاثر ہو کر ان کے خداؤں کو لبیک کہہ رہے ہیں اور اس خوش آمدید کا نتیجہ ہماری ماضی کی تاریخ کو



دیکھتے ہوئے کسی صورت میں بھی سوومند نہیں ہوگا۔ لہذا حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تفسیر کا حق موجود الوقت حالات کی روشنی میں دوسرے مسلمانوں کو دینا درست نہ ہوگا۔

امام اعظمؒ کے بارے میں یہ غلط فہمی ابن خلدون کی پھیلانی ہوئی ہے۔ علامہ نے اسے درست تسلیم کرتے ہوئے جو علمی غلطی کی ہے اس کی اصلاح کرنا اقبال پسندوں کا ایک اہم فریضہ ہے۔ علامہ ابن خلدون سے نہایت متاثر تھے انھوں نے اپنے تاثر کا اظہار اس خطبہ میں اور اس سے پہلے اپنے خطبہ اسلامی ثقافت کی روح میں بڑے اچھے الفاظ میں کیا ہے۔

اقتباس کی دوسری اہم بحث عرف اور تشریح، عرف اور تشریح کے باہمی تعلق کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس موضوع پر بہت سے مسلمان مفکرین نے قلم اٹھایا ہے۔ ان میں سے قابل توجہ ارتشادات امام ربانی مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں ہیں اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں بعنوان ارتفاقات موجود ہیں۔ شاہ صاحب نے یہ بتایا ہے کہ "جب کوئی صاحب شرع پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کی ان عادات اور طور طریقوں سے تعرض نہیں فرماتا جو اس کے دین سے



متصادم نہ ہوتے ہوں، بلکہ انہیں ان کی حالت پر ہی چھوڑ دینا اپنی  
مصلحت ہوتی ہے۔"

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ صاحب شرع پیغمبر وقت  
کی ہر قسم کی رسومات کے ساتھ تعاون کر لیتا ہے اور یوں اپنی  
و مشواریوں کے دائرہ کو وسیع نہیں ہونے دیتا۔ صحیح بات ہے کہ  
صاحب شرع کا کام انتظامات کو درہم برہم کرنا ہرگز نہیں ہوتا  
بلکہ انتظامات میں جو خرابی یا خرابیاں اور بد عنوانیاں ہوتی ہیں۔ ان  
کو دور کرنا اور نیکی بدی میں تمیز کرنا اس کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ وہ  
جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے، اس قوم کے صرف اس عرف کو بحال  
رکھتا ہے جو دین کی رُو سے جائز ہو۔ اور یہ بحالی کسی وقتی مصلحت کی  
بنا پر نہیں ہوتی بلکہ اس نظریہ اور بصیرت کی اساس پر ہوتی ہے کہ اس  
قوم میں جو انبیاء پہلے مبعوث ہوئے ان کی وساطت سے اس قوم  
میں جو باتیں رواج پا گئی تھیں۔ ان میں سے بعض کی صورت تو بالکل  
بدل چکی ہوتی ہے اور بعض اپنے حال پر ہی ہوتی ہیں لہذا ان  
معروف رسومات کو بحال رکھنا سابقہ انبیاء کی باتوں کو زندہ رہنے  
دینا ہوتا ہے۔ اور جو عرف دین سے متصادم ہو، اسے کوئی پیغمبر کسی  
صورت میں بھی پروا نشد نہیں کر سکتا۔ اس کا قلع قمع کرنا ہی تو



اس کا کام ہوتا ہے۔

حضور نبی کریمؐ نے عرب کے عرف میں سے جن باتوں کو بحال رکھا ان کی بحالی اسی بصیرت کی رُو سے تھی۔ اجتہاد کرتے وقت اس طریق سے وہ بات نہیں نکل سکتی جو اقبال کی بات کو پوری طرح نہ سمجھنے کی بنا پر اقبال کے مرید نکال رہے ہیں۔ یعنی ہر زمانے کے مخصوص حالات کی روشنی میں مسائل کا ان سے خواہ مخواہ کا تعلق پیدا کر لینا اور ماحول کے دباؤ سے احکام میں سبلی قسم کی لچک پیدا کر لینا۔

حضور نبی کریمؐ نے عرب کی جن مروجہ رسومات کو قبولیت کی سند عطا فرمائی یعنی جن کو جوہل کاتوں چھوڑ دیا گیا۔ ان کے بارے میں تحقیق کرنے سے کہیں زیادہ یہ تحقیق سود مند ہوگی کہ آپ نے کن رسومات کو پروا نہ کیا۔ اور ان کو جوہل سے اکھیر پھینکا۔ مثلاً دختر کشی کو بند کرنا، فال نکالنے کی ممانعت کرنا۔ کاپہنوں سے مستقبل کے حالات دریافت کرنے سے روک دینا۔ یہ پہا نیرت کو خلاف شرع قرار دینا وغیرہ۔ ان کے مطالعہ سے اسلامی شریعت کے مزاج کی بخوبی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے جن رسومات کو بحال رکھنے کی اجازت دے دی، یا ان کی بجا آوری



پر سکوت اختیار فرمایا۔ وہ سابقہ انبیاء کی پاک تعلیمات کے وہ چند کھڑکے تھے جو کسی نہ کسی طرح تخریف اور تفسیح کی زد سے بچ نکلے تھے۔

علامہ کا حدیث سے متعلق

حدیث سے متعلق اقبال کا نظریہ | جو نظریہ ہے جیسا کہ بیان ہوا

اس کا آخری حصہ نہایت غور طلب تھا۔ اسے کاش احادیث کا انکار کرنے والے اس حصے کو غور سے دیکھتے تو انھیں احادیث کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا اور وہ اس متاع گراں مایہ کو قانون سازی کے وقت نظر انداز کرنے کی ترغیب نہ دلاتے۔

لکھتے ہیں:

”لہذا احادیث کا مطالعہ اگر اور گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلعم نے احکام قرآنی کی تعبیر فرمائی.....“ مثلاً قرآن میں کسی جرم کے لیے سزا کا بیان آتا ہے۔ اس جرم کی صحیح صورت کا تعین اور سزا کا اجرا کس ماحول اور کن حالات میں ہوا۔ تاکہ ہم کسی جرم کو اس کے ماحول کے تعلق کی روشنی میں پوری طرح سمجھ لیں۔ اور سزا کو معاشرتی اور سیاسی حالات کے تعلق کے ساتھ متعین کرنا جان لیں۔ اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ ”تو اس سے ان قوانین کی حیاتی قدر و قیمت کے



فہم میں اود بھی آسانی ہوگی، جو قرآن پاک نے قانون کے متعلق قائم کیے ہیں۔ "یہ حیاتی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس سے یہ مراد ہے کہ قرآن میں ایک حکم نص قطعی کے ساتھ موجود ہے۔ مثلاً سرقہ، زنا، وغیرہ کی سزا اب اس حکم کا اجرا اس وقت کے حالات سے متعلق ہے یا اسے ووامی حیثیت حاصل ہے۔ اس بارے میں فیصلہ کرنا اس قانون کی حیاتی قدر و قیمت معلوم کرنا ہے۔ اور جب یہ قدر و قیمت واضح اور معلوم ہو جائے گی تو پھر یہ ان اصولوں کی حیاتی قدر و قیمت ہی کا پورا پورا علم ہے۔ جس کی بدولت ہم اپنی فقہ کے بنیادی ماخذ کی از سر نو تعبیر اور ترجمانی کر سکتے ہیں۔ یعنی اس قدر و قیمت کے تعین کے بعد یعنی کسی جرم کی سزا یا کسی حکم کی وقتی یا ووامی صورت جان لینے کے بعد ہم بدلے ہوئے حالات میں ایسے جرم کے لیے سزا تجویز کرنے کی خاطر اپنی فقہ کی جو نئی تدبیریں کریں گے۔ اس میں فقہ کے ماخذ (قرآن احادیث) کی از سر نو یعنی حالات کے تقاضوں کی روشنی میں تعبیر کر کے قانون سازی کا حق ادا کریں گے۔"

علامہ نے جو کچھ کہا ہے، اس سے احادیث کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ ان اشارات سے احادیث کے غیر ضروری ہونے کے لیے بھی یہ جو نئی تدبیریں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ ایک سر پھر شخص یہ



کہہ سکتا ہے، کہ علامہ کی مراد یہ ہے کہ اس مجموعے کو ناقابل اعتبار سمجھ کر غور و فکر سے محض اس لیے مطالعہ کرو کہ ان سے کس مسئلے کے لیے کیا معلومات ملتی ہیں، پھر اس کے بعد بدلے ہوئے حالات میں یہ ہمارا اپنا کام ہے کہ کس طرح کسی قرآنی حکم کی تعبیر کریں۔

ہماری بحث اب اس موڑ پر آگئی ہے کہ زمانے کے حالات اور احکام کا تعلق کیا ہے۔ قرآنی احکام اور ان کی وہ تعبیر جو حضرت رسالت مآب نے فرمائی تھی کیا وہ محض عرب کے اس وقت کے ماحول سماجی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی حالات کی روشنی میں تھی؟ اور اب جب ماحول میں تبدیلی آچکی ہے تو کیا ان احکام میں بھی تبدیلی کرنی ضروری اور لابدی ہے؟ مثلاً:

۱۔ قرآن نے باپ کے ترکے میں بیٹی کو بیٹے کے حصے کا نصف حصہ دلایا ہے اور نص قطعی اس پر شاہد ہے حضور نے بھی اس کی یہی تعبیر فرمائی ہے۔

۲۔ سرقہ کے جرم پر قرآن نے نص قطعی کی رو سے پورے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کی ہے اور حضور نے اس کی یہی تعبیر کر کے اس پر عمل فرمایا ہے۔

۳۔ زنا کے جرم کے لیے اس مجرم کے محسن یا غیر محسن ہونے کی



زور سے حد مفرد کی گنتی ہے حضور نے اس حد کو اپنے عہد میں یوں ہی جاری رکھا ہے۔

۴۔ قرآن نے محرمات کی جو فہرست بتائی ہے حضور نے اس کی تعبیر کرتے وقت اس فہرست کو مکمل کیا ہے۔ آپ کے عہد مبارک میں اس پر عمل ہوتا رہا ہے اور آج تک ہوتا ہے۔

۵۔ قرآن نے شراب اور جوئے کو حرام قرار دیا ہے حضور نے اس کی بھی تعبیر فرمائی ہے اور ان کا حرام ہونا آج تک بدستور ہے۔

ہم سر دست ان پانچ چھ عنوانات کو زیر بحث لائیں گے۔ اس سے دوسرے معاملات پر بھی روشنی پڑ سکے گی۔

مرد و زن کی مساوات کے خوش کن نعرے  
مساوات مرد و زن | یورپ سے درآمد کیے جانے پر سب سے پہلے تہ کی ہیں اس مساوات کے لیے جدوجہد شروع ہوئی عورت نے مرد کے برابر کے حقوق کا مطالبہ کیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہر میدان میں ہر موڑ اور ہر زاویے میں برابری کے اس دعوئی نے یورپ میں جو گل کھلائے ہیں اس سے یورپ کی جدید خاتون واقف ہو رہی ہے، مگر تہ کی ز اور آج پاکستان وغیرہ ممالک کی خواتین،



کے لیے یہ تصورات نہایت مرغوب اور دل پسند تھے۔ یورپ میں عورتوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اور ان سے ہر وقت کھلے بندوں کی اختلاط رکھنے کی نیت سے ان کے جذبات کے ساتھ کھیلا گیا۔ اور اس طرح آزادی نسوان کی تحریک نے جنم لیا جس کے نتیجہ کے طور پر مرد و زن زبانی طور پر مساوی اچھٹیت ہو گئے مگر عملی طور پر عورت کو اس کے ان حقوق کا عشر عشر بھی نہ مل سکا جو اسلام آج سے تیرہ سو سال پہلے اسے دے چکا ہے۔

ترکی کا شاعر ضیا "زن و مرد کی مساوات کے جوش میں اسلام کے قانون عالمہ میں بھی جیسا کہ آج کل اس کو سمجھا اور عمل میں لایا جا رہا ہے چند تبدیلیوں پر زور دیتا ہے :

"اور پھر عورت ہے میری ماں، میری بہن، میری بیٹی، یہ عورت ہی تو ہے جس کی بدولت میری زندگی کی گہرائیوں سے مقدس ترین آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں۔ وہ میری محبوبہ ہے، میرا آفتاب، میرا ماہتاب، میرا ستارہ ہے۔ اُس نے مجھے زندگی سے آشنا کیا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقدس قانون اس حسین جمیل مخلوق کو قابل نفرت ٹھہرائے! علمائے قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر میں کھو کر ڈھائی ہے، جب تک عورتوں کی صحیح قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوگا،



حیاتِ ملی ناکمل رہے گی۔ اہل و عیال کی پرورش میں عدل و انصاف پر عمل کرنا چاہیے اس لیے تین چیزیں ہیں جن میں مساوات ناگزیر ہے۔ طلاق میں، علیحدگیِ خلع میں، وراثت میں، حسب تک وراثت میں عورت کو مرد کا نصف اور رواج میں چوتھائی قرار دیا جاتا ہے۔ عاقلہ کا درجہ بلند نہیں ہوگا، نہ ملک کا۔ ہم نے دوسرے حقوق کے لیے عدالتیں کھول رکھی ہیں لیکن عاقلہ کی زمام مذاہب فقہ کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ میں نہیں سمجھتا ہم نے عورتوں کو کس لیے بے بس چھوڑ رکھا ہے کیا ملک کی کوئی خدمت بجا نہیں لاتیں۔ یا پھر ہم چاہتے ہیں اس کی سوئی ایک تیز سنگین میں بدل جائے۔ وہ ایک انقلاب برپا کرے اور اپنے حقوق ہمارے ہاتھوں سے چھین لے؟

جدید ترکی کا یہ انقلاب پسند شاعر قانون وراثت  
**قانون وراثت** میں ایک لڑکی اور لڑکے کے حصوں کی برابری  
 کا خواہاں ہے حالانکہ قرآن نے نص قطعاً کی رو سے لڑکے سے لڑکی  
 کا حصہ نصف قرار دیا ہے:

يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِىٓ اَوْلَادِكُمْ لِلَّذِى كَرِهْتُمْ  
 حَتَّىٰ الْاِثْنَيْنِ

(۲: ۱۱۰)

ترجمہ: اللہ نے تمہاری طرف سے میرے لئے تمہارے میں اس کی اولاد کا



حصہ اس طرح متعین ہے کہ ایک لڑکا دو لڑکیوں کے برابر  
ہوتا ہے۔

قرآن اس صورت میں حصول کے واضح تعین کے بعد اس تعین کو  
حدود اللہ قرار دیتا ہے چنانچہ ارشادِ باری ہے:

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ  
يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ  
مُخْلِطِينَ فِيهَا وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ وَمَنْ  
يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ  
يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ  
عَرِيبٌ ۝

(۲: ۱۷۳-۱۷۴)

ترجمہ: یہ اللہ کی جانب سے مقررہ حدود ہیں، جو کوئی اللہ اور اس  
کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ اسے جنت میں داخل  
کرے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ وہاں ہمیشہ  
رہے گا، اور یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ اور جو کوئی اللہ اور اس  
کے رسول کی اطاعت نہیں کرے گا اور حدود اللہ کو توڑے  
گا، اللہ اسے دوزخ میں داخل کرے گا، وہاں وہ ہمیشہ  
رہے گا اور اسے سخت عذاب ہوگا۔



اب آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس تخصیص کو ترک کی کا شاعر علماء کی  
مفسرانہ ٹھوکہ کیوں قرار دے رہا ہے۔ وہ کھل کر قرآن کے اس فیصلے  
کو نا انصافی کیوں قرار نہیں دیتا محض اس لیے کہ اس طرح وہ اسلام  
کے دائرہ سے نکل جاتا ہے اور اس کی بحر شا کے زاویے بدل جاتے  
ہیں۔ علامہ مرحوم نے اس شاعر کے اس مطالبہ کے متعلق جو لکھا ہے  
وہ قابل مطالعہ ہے اپنا پتہ لکھتے ہیں :

”رہا ترک کی شاعر کا مطالبہ سو میں سمجھتا ہوں وہ اسلام کے قانون  
عائکہ سے کچھ بہت زیادہ واقف نہیں۔ وہ نہیں سمجھتا کہ قرآن پاک  
نے وراثت کے بارے میں جو قاعدہ نافذ کیا ہے اس کی معاشی  
قدر و قیمت کیا ہے۔ شریعت اسلامی میں نکاح کی حیثیت ایک عقد  
اجتماعی کی ہے اور بیوی کو حق حاصل ہے کہ بوقت نکاح شوہر کا حق  
طلاق یعنی شرائط کی بنا پر خود اپنے ہاتھ سے لے لے۔ یوں امر طلاق میں  
تو مرد و زن کے درمیان مساوات قائم ہو جاتی ہے۔ رہی وہ اصلاح  
جو شاعر نے قانون وراثت میں تجویز کی ہے۔ سو اس کی بنا غلط فہمی پر  
ہے اگر قانون ان کے حصول میں مساوات قائم نہیں کی گئی تو اس سے  
یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے،  
اس لیے کہ یہ خیال تعلیمات قرآنی کے منافی ہے۔ قرآن مجید کا



صاف اور صریح ارشاد ہے، ولھن مثل الذی علیہن (۲: ۲۲۸) لہذا لڑکی کا حصہ متعین ہوا تو کسی کمتری کی بنا پر نہیں بلکہ ان فوائد کے پیش نظر جو معاشی اعتبار سے اسے حاصل ہیں علیٰ ہذا اس مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اس ہیئت اجتماعیہ میں جس کا وہ خود بھی ایک حصہ ہے، اسے دیا گیا۔ پھر شاعر کا اپنا خیال بھی تو یہی تھا کہ مسئلہ وراثت کو تقسیم دولت کے ایک انگ ٹھٹک جرز و کی حیثیت سے دیکھنے کی بجائے منجملہ ان عوامل کے تصور کرنا چاہیے۔ جن کی عرض غایت ایک ہے۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے لڑکی اس سارے چیز کی خود ہی مالک ہے جو اسے والدین سے ملتا ہے، اور نہ ہی کسی سے اس کی مرضی کے مطابق موجب بھی ٹھہرایا جاسکتا ہے اور غیر موجب بھی اور جس کی ادائیگی تک وہ خاوند کی ساری جائداد کو قبول رکھ سکتی ہے۔ اس کے کفاف کی ذمہ داری بھی تاحین حیات خاوند پر رہتی ہے۔ اب

اے جب اقبال کے پیر و اقبال کی اس تنقید کو نظر انداز کر کے مسئلہ کی ابتدائی صورت ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں تو اقبال کا صحیح مسلک ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

مؤلف



اگر اس نقطہ نظر سے قانون وراثت کا جائزہ لیجیے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اسلام نے لڑکوں اور لڑکیوں کی معاشی حیثیت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ برعکس اس کے ان کے سهام میں جو عدم مساوات نظر آتی ہے وہی ان کی مساوات کا ذریعہ بن جاتی ہے جس کا شاعر نے مطالبہ کیا ہے: یا اے

ہمارے نزدیک علامہ کے بیان کردہ نکات کے علاوہ یہ نکتہ بھی اس ظاہری عدم مساوات کو سمجھنے کے لیے قابل توجہ ہے کہ لڑکی نے فطرت کے قوانین کے نتیجے میں اور نسل انسانی کے تحفظ و بقا کے لیے لازماً اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہو کر نیا گھر بسانا ہوتا ہے۔ لہذا اس کے والدین کی ذمہ داریوں میں ان کے معاشی تعلقات کی بنا پر زندگی کی دستوں میں کھلی ہوئی لین دین کی صورتوں کا پورا کرنا لڑکی کے ذمہ نہیں (اخلاقی یا قانونی طور پر) لگایا جاسکتا۔ ان سے عہدہ برآ ہوتا لڑکوں کا کام ہوتا ہے۔ لہذا اس رو سے بھی قرآن نے ایک لڑکی کو لڑکے کے برابر کا حصہ نہیں دلایا۔ علاوہ ازیں بالعموم بالغ لڑکے اپنے والد کے ساتھ کمائی میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور لڑکیاں ان سے کمتر درجہ ہی کی امداد کر سکتی ہیں لہذا

ان ترجمہ خلیات اقبال تشکیل جدید الہیات اسلامیہ۔ ص ۲۶۳ -



قانونی تقسیم میں یہ نظامی خدمت مساوات لازمی ٹھہرتی ہے۔ ضیاء کے خیالات پر تنقید کرنے کے بعد حضرت علامہ فرماتے ہیں:

”در اصل قرآن مجید کے قانون وراثت قوانین وراثت کا بخور مطالعہ کی تہ میں جو بقول فان کہ میر شریعت

اسلامیہ کی ایک نہایت ہی اچھوتی نشانخ ہے، جو اصول کام کر رہے ہیں ان پر مسلمان ماہرین قانون نے ابھی تک کما حقہ توجہ نہیں کی۔ ہمیں چاہیے اس بڑے تلخ طبقاتی نزاع سے جو آج کل کے معاشرے میں جاری ہے سبق حاصل کریں۔ میرا خیال ہے کہ جہاں ہم نے اپنی شریعت کا مطالعہ اس انقلاب کے پیش نظر کیا جو معاشیات کی دنیا میں ناگزیر ہے ہمیں اس کے بنیادی اصولوں میں بعض ایسے پہلو نظر آجائیں گے جو آج تک ہم پر منکشف نہیں ہوئے۔ پھر اگر ایمان و یقین سے کام لیا گیا تو ان میں جو حکمت پوشیدہ ہے ہم اس سے اور زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے“

ان سطور سے بظاہر ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ اسلامی قوانین وراثت میں بھی معاشی دنیا کے انقلابات کی روشنی میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ہم دلتوں کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے علامہ کا اصل مقصد کیا ہے۔ کیا وہ معاشی انقلاب کی روشنی میں



نص کا نشا و مقصود تبدیل کرنا واسمبھتہ تھے ؟

اور جب علامہ ترقی کی بیداری کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں تو ان سے اس غلط فہمی کو اور تقویت ملتی ہے۔

”در اصل یہ صرف ترک ہے جو اعم السنہ میں پیدا  
تذکروں کی بیداری پرستی کے خواب سے بیدار ہو کر شعور ذات کی  
 نعمت حاصل کر چکے ہیں..... آج جو مسئلہ تذکروں کو درپیش ہے  
 کل دوسرے بنا و اسناد میہ کو پیش آنے والا ہے اس لیے سوال پیدا  
 ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں کیانی الواقع مزید نشو و نما اور ارتقار کی  
 گنجائش ہے لیکن اس سوال کے جواب میں ہمیں بڑی زبردست کاوش  
 اور محنت سے کام لینا پڑے گا۔ گو ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ اس کا  
 جواب اثبات ہی میں دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہم اس مسئلے میں وہی  
 روح برقرار رکھیں جس کا اظہار کبھی حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوا تھا۔  
 وہ امت کے اولین دل و دماغ ہیں جو ہر معاملے میں آزادی رائے اور  
 تنقید سے کام لیتے تھے۔ اور جن کی اخلاقی جرات کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ  
 رسالت ناب صلعم کی حالت نزع میں کہہ دیا کہ ہمارے لیے اللہ کی  
 کتاب ہی کافی ہے۔“

۱۔ ترجمہ خطبات ص ۲۵۱ منکرین حدیث اس قول کو بار بار دہراتے ہیں۔



ان سطور کو پڑھ کر ایک قاری یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ علامہ کے نزدیک  
 ترکوں کی آزادی ہر جہت سے خوش آئند ہے۔ نیز وہ قرآن کے علاوہ  
 کسی اور ماخذ کو قانون کی اساس قرار دینا نہیں چاہتے۔ حالانکہ علامہ  
 کا مسلک یہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ اجتہاد کی ضرورت پر زور سے  
 رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ انھوں نے ترکوں کی آزادی افکار پر  
 کڑی تنقید کی ہے۔ اسی خطبے میں انھوں نے ضیا کے افکار پر کڑی  
 ضرب لگائی ہے اور آزادی افکار کی تحریک کو حد و کے اندر رکھنے  
 کا مشورہ دیا ہے۔

محولہ بالا سطور کے فوراً بعد لکھتے ہیں ”بہر حال ہم اس تحریک کا جو  
 حریت اور آزادی کے نام سے عالم اسلام میں پھیل رہی ہے اس  
 سے خیر مقدم کرتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیے۔ آزاد خیالی کی یہی تحریک  
 اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور  
 انتشار کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے  
 مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں بشرطیکہ اس پر  
 کوئی روک عائد نہ کی گئی، اصلاح کی جائز حد و سے تجاوز نہ ہی  
 کر جائیں“۔



اب علامہ کا مطلب واضح ہے۔ گذشتہ صفحت میں  
**وضاحت** قوانین وراثت کی بحث کے ضمن میں ان کے افکار  
 سے یہ ثابتہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ حالات کی روشنی میں نص کی تفسیر کو بھی  
 رد رکھتے ہیں۔ اس کی وضاحت ملاحظہ ہو۔  
 اجماع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لیکن اس سلسلہ میں دو سوال جو اب طلب ہیں ایک تو یہ کہ  
 اجماع کیا قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے؟ ایک اسلامی مجلس میں تو یہ سوال  
 اٹھانا ہی غیر ضروری ہے لیکن ہم یہ سوال اٹھا رہے ہیں تو محض اس  
 غلط بیانی کے پیش نظر جو ایک مغربی نقاد نے اپنی تصنیف ”اسلامی  
 نظریہ اے بالیات“ میں کی ہے، جسے جامعہ کو ایسا نے شائع کیا  
 اس کتاب کے مصنف نے بغیر کوئی سند پیش کیے ہوئے یہ لکھ دیا  
 ہے کہ احناف اور معتزلہ کے نزدیک اجماع قرآن مجید کا بھی ناسخ ہے  
 حالانکہ اسلامی فقہ میں اس قسم کی غلط بیانی کی تاکید میں کوئی ادنیٰ سے  
 ادنیٰ مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ نہ حدیث میں ہمیں اس طرح کا  
 کوئی اشارہ ملتا ہے۔۔۔۔۔“

گویا علامہ کے نزدیک کوئی قانونی ضرورت قرآن کی ناسخ نہیں  
 ہو سکتی، اب ان کے افکار کی روش سے ان قوانین وراثت کی تفسیر کا امکان



کیسے نکل سکتا ہے جن کا تعین قرآن کی نصوص کی روش سے کیا گیا ہے

حدیث کا ایک اشارے کی اہمیت | محمولہ بالا اسطور سے  
یہ بات بخوبی واضح

ہوتی ہے کہ علامہ کے نزدیک احادیث کا ایک اشارہ کھلی بڑی ہی  
اہمیت رکھتا ہے۔ لہذا ان کا منشا ما سبق بحث میں صرف یہ ہے  
کہ ہمیں اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔ اور اس مشکل کام میں قوانین اسلامی  
کے ماخذ کا مطالعہ گہری نظر اور باخبرگی سے کرنا چاہیے۔ تاکہ جدید  
حیالات اور تقابلات کے تقاضے اسلامی حدود کے اندر رہ کر پورے  
ہو سکیں۔ اس مسئلے میں وہ جس روح کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ  
حضرت عمرؓ کی پیروی میں بظاہر ایسی نظر آتی ہے کہ اس سے مراد  
احادیث سے بے نیازی ہے لیکن صحیح صورت حال اس کے  
بالکل برعکس ہے۔

ان کی مراد یہ ہے کہ اجتہاد کی گنجائش پر سوچ بچار کرتے  
| صحیح مفہوم  
علاقہ کا ایک مسلمان کو بڑی دشواریوں سے

عہدہ برآ ہونا پڑے گا۔ کہ کیا اسلامی قانون میں فی الواقع مزید نشوونما  
کی گنجائش کھلی ہے۔ ان کے نزدیک اس کا جواب مثبت میں ہے تو اس کے بعد جو  
روح برقرار رکھنی پڑے گی وہ تنقید اور جرح کی روح ہے جس کا



اظہار حضرت عمرؓ کی ذات میں ہوتا ہے۔ اس تنقید کے بڑے فائدے ہیں اسی کی بدولت صحیح طریق کار متعین ہوتا ہے اس کے بعد انہوں نے اس تنقیدی روح والی ایک مکمل شخصیت کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان کی تنقیدی جرات کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے جناب رسالت پناہ کی حالت نزع میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔ ان سطور سے حضرت عمرؓ کی تنقیدی روح کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ قرآن اور حدیث کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ مابقی دو تین سطروں کو وقت نظر کے ساتھ دیکھنے سے ہمارا یہ استدلال، ایک صاحب نظر تاری کو قائل کر سکے گا۔

تاہم یہاں یہ سوال پیدا کیا جاسکتا ہے کہ یہ راستے اقبال ایک سوال کی زبانی حضرت عمرؓ کی تو ہے ہی۔ اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا ارشاد سنت رسول اللہ سے بے نیازی اور اعراض کا اظہار نہیں ہے۔ اس وقت شہرت یافتہ مکتوب ہدایت نامے کے طور پر صرف ایک کتاب اللہ ہی موجود تھی۔ لہذا اس سے رجوع کرنے کا اظہار حضرت رسالت پناہ کی سنت جاریہ سے رجوع کا تقبض نہیں ہو سکتا تھا حضرت عمرؓ اگر احادیث سے بے نیازی کے دعویدار ہوتے تو ان



سے کوئی حدیث مروی نہ ہوتی حالانکہ احادیث کے مستند مجموعوں میں ان کی روایتوں کی تعداد ۵۰ سے زیادہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ روایات ان کی نہیں ہیں خواہ مخواہ ان کے ذمے لگا دی گئی ہیں، تو اسے اس امر کا ثبوت دینا ہوگا۔ اور حسب تک صحابہ کی ایک معتبر اور کثیر تعداد کو انعوف باللہ منافق نہ قرار دیا جائے اس باطل دعویٰ کا اظہار ہی ممکن نہ ہوگا، اور جو معترض صحابہؓ کو منافق ٹھہرائے گا۔ اسے حضورؐ کی تعلیم و تربیت کو بدرجہ اولیٰ ناقص اور بے اثر تسلیم کرنا ہوگا۔ اور جب کوئی حضورؐ کی تعلیم کو بے اثر اور ناقص قرار دے دے گا، تو خود حضورؐ کی ذات بابرکات کی کوئی اہمیت اس کی نظر میں نہیں ہوگی ظاہر ہے کہ یہ معترض دائرہ اسلام میں کیسے رہ سکتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کے اس جواب کا نظم معترض کو کن ذرائع سے ہوا ہے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ اس اطلاع کا ماخذ ہی حدیث ہے۔ اب ہم اس اطلاع کو تو صحیح تسلیم کریں، اور جس مجموعے سے ہمیں یہ اطلاع ملی ہے اس مجموعے کی دوسری اطلاعات کو غیر مستند اور غیر صحیح قرار دیں تو رد و قبول کی یہ روش کس منطبق کی رُو سے درست ہوگی۔

ایک ضمنی بحث

رحلت کے وقت حضورؐ کا کاغذ طلب کرنا حضرت مجدد الف ثانیؒ



نے حضور کے کاغذ طلب کرنے کے واقعہ پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ خواجہ ابوالحسن بدخشانی کشمیری کی طرف لکھتے ہیں:

”حضرت رسالت خاتمیت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مرض

موت میں کاغذ طلب کیا اور فرمایا:

اَيْتُونِي بِقِطْحَانٍ اَكْتُبُ كِتَابًا لَنْ تُضِلُّوا

بَعْدِي (بخاری)

کاغذ لافکہ میں کچھ لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جاؤ۔

اور حضرت فاروقؓ اور چند اصحاب نے توقف کیا، اور کہا کہ:

حسبنا کتاب اللہ (ہیں اللہ کی کتاب کافی ہے)

اور کہا:

اَهْجَا اسْتَفْرَمُوهُ؟

کیا آپ غشی کی حالت میں ایسا فرما رہے ہیں، اچھی طرح

پوچھ لو۔

حضرت فاروقؓ کا توقف رد و انکار کے باعث نہ تھا۔ پناہ بخدا

ایسے منجبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وزیروں اور ہم نشینوں سے جو

خلق عظیم کے ساتھ متصف تھے۔ اس قسم کی بے ادبی کیسے ہو



سکتی ہے حضرت فاروق رضی اللہ عنہما کا مطلب استفہام واستفسار سے یہ  
 تھا کہ اگر کوشش و اہتمام کے ساتھ کاغذ طلب فرمائیں تو لایا جائے۔  
 اگر آپ اس بارہ میں کوشش نہ فرمائیں تو ایسے نازک وقت میں آپ  
 کو تکلیف نہ دی جائے کیونکہ اگر وحی اور امر سے آپ نے کاغذ طلب  
 فرمایا ہے، پھر تو تاکید اور مبالغہ سے کاغذ طلب فرمائیں گے اور جو کچھ  
 حکم ہو گا لکھیں گے کہ وحی کی تبلیغ نبی پر واجب ہے، اگر یہ مطلب  
 امر و وحی سے نہیں ہے، بلکہ چلتے ہیں کہ نکر و اجتناب کی رو سے  
 کچھ لکھیں تو وقت پادری نہیں کرتا کیونکہ پایہ اجتناب و آپ کے رحلت  
 فرما جانے کے بعد بھی باقی ہے، آپ کی امرت کے مستنبط اور  
 مجتہد لوگ کتاب اللہ سے جو دین کا اصل و اصول ہے، احکام اجتناب  
 نکال لیں گے جب حضور نے اس بارہ میں اہتمام نہ فرمایا تو  
 معلوم ہوا کہ آپ کا ارشاد وحی کی رو سے نہیں تھا۔ وہ توقف جو  
 مجر و استفہار کے لیے ہومزوم نہیں ہے۔ ملائکہ کو ام نے حضرت  
 آدم کی خلافت کی وجہ اللہ سے دریافت کی حضرت زکریا نے  
 حضرت یحییٰ کی پیدائش کی خوشخبری کے وقت تیرانی کا اظہار کیا۔  
 حضرت مریم نے عیسیٰ کی پیدائش کے بارے میں وحی پاکہ  
 کہا:







میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے عشق رسول کا ذکر کیا ہے:

۵ پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس  
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

یہاں صرف رسول کا ذکر ہے۔ کیا اس سے یہ معنی نکل سکتے ہیں؟  
کہ ایسا کہنے والا اپنے تعلق کو رسول کی ذات تک ہی رکھ رہا ہے اور  
خدا سے بے نیانہی کا اظہار کر رہا ہے۔ اب ہم اصل بحث سے جوع کرتے ہیں  
قرآن نے چوری کرنے والے مرو یا عورت کی سزا ہاتھ کاٹنا  
سزاقہ قرار دی ہے۔ اور صرف یہی واحد سزا شریعت اسلامیہ کی  
رُو سے سزا ہے۔ اس میں ترمیم کرنا نص کے حکم قطعی کو چیلنج کرنا ہے  
قرآن کے جس ضوابط پر مغرب کے اہل علم نے اعتراضات کیے  
ہیں ان میں سے ایک یہ حد بھی ہے، اسے بغایت درجہ وحشیانہ اور  
انسانیت سوز قرار دیا ہے۔ اور اس پر ویسکنڈے کے زیر اثر چند  
مسلمان مفکرین کی بھی نئی روشنی میں یہی رائے ہے کہ اگر یہ حد جاری  
کر دی جائے گی تو اسلامی معاشرے میں سزا یا باہتھو کٹے نہایت  
کم ہیہ منظر پیش کریں گے۔ اور یوں سفائی کا یہ منظرہ اسلام کو بدنام  
کر دے گا۔ علاوہ انہیں ہتھو کٹا رچورا معاشرے کے لیے ایک



مستقل بوجھ بن جائے گا۔ یہ سزا عرب کے اُس وقت کے حالات کے مطابق درست ہوگی مگر جدید نظریات اور ترقی یافتہ اقوام کے قوانین کے پیش نظر درست نہیں ہے۔

یہ نظریات، بہ ظاہر نہایت خوش کن اور رحم و کرم پر مبنی نظر آتے ہیں لیکن غور سے دیکھنے پر یہ معلوم ہوگا کہ اس سزا کے اندر جو مصلحت کار فرما ہے وہ کسی طرح بھی نظر انداز نہیں جاسکتی۔ اسلام سب سے پہلے ایک متوازن معاشرے کو جنم دیتا ہے، ہر کسی کے لیے زندہ رہنے کے لیے برابر کے مواقع پیدا کرتا ہے۔ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے۔ منظم قوم کو اس کے حق و لاٹا ہے اور اس کے بعد اسلامی قوانین کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اب ایک شخص اس متوازن اور استوار نظام کو توڑنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اُس کی جسارت بے جا کیسے بروا شست کیا جاسکتا ہے۔ جب سزا کے طور پر ایک دو چوروں کے اٹھ کاٹ دیے جاتے ہیں تو چوری کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ دوسرے بدتماش افراد اس سزا سے ایسی عبرت پکڑتے ہیں کہ دینی قانون کو توڑنے سے پہلے اُس کا انجام نظر آجاتا ہے۔ قانون کو توڑنے سے پہلے اُس کا انجام ہی تو ہوتا ہے جو جرم پر اُکسا تا ہے یا باز رکھتا ہے۔ جب ایک مجرم یہ سمجھتا ہے کہ قانون کی



فلاں فلاں چول ڈھیلی ہے، وہاں سے یوں مدوہل سکتی ہے۔ یہاں سے یوں بات بن سکتی ہے جیل کے اندر رہ کر آخر کیا ہوگا۔ تو اس انجام کے خیال سے جرم کرنے پر اس کی طبیعت میں دلیری پیدا ہو جاتی ہے، اس کے برعکس سزا کی عبرت ناکی، منصفوں کی انصاف پسندی، رشوت اور سفارش کی بے اثری اس کے جرم کو اس کی اپنی نظروں میں بھیا تک بنا دیتی ہے۔ اس طرح فرد فرد کے اندر ایک پھر پھر مقرر ہو جاتا ہے، جو اسے جرم کرنے سے پہلے ہی روک لیتا ہے۔ اسلام نے جرم کرنے کے وردا زوں کو بند کرنا چاہا ہے جب کہ موجودہ قوانین جرم ہو جانے کے بعد اس کا مداوا کرنے کے درپے ہیں۔ اس کے برعکس اگر جدید نظریات کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہونے پر آمادہ ہوں۔ کچے پکے اعتراضات سے خوف کھا کر اور وحشت و ہرپریت میں ہمارے نامہ رکھنے والی اقوام کی زبانی زبانی رحم پروری کی قرار دے لیں کہ ہم اس اسلامی حکمت کو خیر باد کہہ دیتے ہیں جو اس حد کے اندر مستور ہے تو اس کا نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ سارا معاشرہ اطمینان سے بے نصیب ہو جاتا ہے۔

ہم اس سے بخوبی واقف ہیں کہ انصاف کی کہ سی پر بیٹھنے والوں کی نظر چور کے فعل پر ہی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ انہیں چور کے



پیٹ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ معاشرے کے اس نظام کو بھی دیکھنا چاہیے جو ایک بھلے مانس کو چور بن جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سب درستہ لیکن اس سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکل سکتا کہ چور کی سزا میں ہی ہم اپنی مرضی سے ایسی ترمیم کر لیں جو نصوص کے خلاف پڑتی ہو۔ اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اصلاح پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ معاشرے کو درست کر کے اسلامی قوانین کے نافذ کرنے کے لیے ماحول کو سازگار بنایا جائے اور اس کے بعد مجرم کو صحیح سزا دی جائے۔

اسلام نے مباح کاموں کا دائرہ مناسبت حد تک وسیع رکھا ہے **زنا** اس دائرے کو اس کی مقررہ دستخطوں تک بہرقرار رکھنے کے بعد زنا کا ارتکاب کرنے والوں پر حد جاری نہ کرنا اسلام کے ضابطہ کے لیے تباہی لانا ہے۔ محسن اور غیر محسن کی تمیز کر کے اسلام نے حدیں جو انبیاء رکھا ہے اس میں بڑی حکمت اور معاملہ فہمی ہے جس تہذیب میں زن و مرد کی باہمی رضا کے طور پر بدی کے اس فعل کو قانون کی گرفت سے آزاد سمجھا جاتا ہو وہاں اس جرم کی صحیح سزا کا بیان ایک مضحکہ ہسی ہو سکتا ہے۔ اپنی آزاد مرضی سے ایک عورت اور ایک مرد بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو اس کی حمایت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس فعل



کا بڑا ہونا تو تلب ہے کہ طرفین میں سے کسی ایک کی رضا مفقود ہو ورنہ  
 اس کی بُرائی کوئی بُرائی ہی نہیں ہے۔ نفسیات کے عالم کالج کے  
 طلبہ کے سامنے حسین اور ولپیڈیرو لائل کی رُو سے یہ ثابت کر رہے  
 ہیں کہ انسان کے اندر جب کسی کام کو کرنے کی شدید خواہش پیدا  
 ہو جائے اور وہ اس خواہش کو سوسائٹی کے دباؤ کے زیر اثر یا  
 کسی خوف کی بنا پر پورا نہ کر پائے تو یہ خواہش اس کے لاشعور میں چلی  
 جاتی ہے اور اس کے مستقل دباؤ رکھنے سے انسان کی صحت پر  
 نہایت بُرے اثرات ثابت ہوتے ہیں۔ وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ لہذا  
 انسان کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے پورے پورے مواقع  
 دینے چاہئیں۔ اسی طرح ایک صحت مند معاشرہ پیدا ہو سکتا ہے۔  
 ان مواعظِ خبیثہ کا اثر اس کے سوا اور کیا ہے کہ جوانوں کو زنا کرنے  
 پر اور سائٹیفک لائٹوں پر بے حیائی کو رائج کرنے پر اکسایا جا رہا ہے  
 جب ایک نوجوان اس طرح کی معلومات فراہم کر لیتا ہے تو اس کے  
 اندر کا شیطان زیادہ قوی ہو کر اس کے اعصاب پر مکمل تسلط جما لیتا  
 ہے اور برتھ کنٹرول کے جدید طریقے اور ان کے رواج کی سرکاری  
 حمایت اور ان کے نتیجے کے طور پر ابدی خوشحالی کی ضمانت، شیطان  
 کی اس حکومت کو مستحکم سے مستحکم تر کر دیتی ہے۔ اب منبر پر لا کھوپکارا



جائے۔ اخلاق کے سینکڑوں درس ویسے چاہیں سب اکارت جائیں گے۔ اسلامیات کا استاد اپنے رنگ میں جو ان طلبہ کو سمجھانے کے لیے جو چاہے کیا کرے، اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا سنیما کے باہر دیواروں پر چربی تختوں پر قد آدم نیم عریا تصاویر ایک نظر دیکھ لینے کے بعد اس دور کا جو جوان پورے دن کے لیے دانائی کی کسی بات کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتا ہے۔ ہمارے ارباب بست و کشاد نے جو ان دل و دماغ کے لیے جو غذا مہیا کر رکھی ہے۔ اس کے فاسد اثرات سے بچنا نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے؛

درمیان قہرِ دریا تختہ بندم کروہ  
بازمی گوئی کہ دامن تر من ہیشیار باش!

اب ایسے معاشرے میں اگر زنا رواج پائے تو حسبِ حال رواج پائیگا۔ اس کی تشریف آوری غیر متوقع نہیں بلکہ وراثت کے اثر کے طور پر ہوگی۔ عصمت فروشی کے اڈے اگر فروغ پاتے ہیں تو اس کی ذمہ داری اس نظام پر ہے جو ان کو پیدا کرنے اور بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ عصمت فروشی کو بند کرنے کے لیے کبھی کبھار ادھر ادھر سے ایک آواز سنانی دیتی ہے نہ ہونے سے اس کا ہونا بہتر ہے



لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ایک طرف تو ہم اپنی تعلیم، تفریح اور تبلیغ کی بدولت بدکاری کے شعلوں پر پٹرول ڈال رہے ہیں اور دوسری طرف دامن صدمہ چاک لیے ان فلک بوس شعلوں کے بچھ جانے کے خواہش مند بھی ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہماری یہ خواہش ہمارے قلب و نظر کی صحیح ترجمان ہے یا ہمارا یہ فعل ہماری شخصیت کی نمائندگی کر رہا ہے جو ان شعلوں کو زندہ رہنے کی قوت دے رہا ہے۔

ماحول بدل چکا ہے، مگر زندگی اور فطرت کی بنیادی حقیقتیں بدستور غیر متبدل اور غیر متغیر حالت میں ہیں۔ اسلامی سزائیں فطرت کے عین مطابق ہیں۔ آج یہ سزائیں اگر فطرت کے خلاف نظر آتی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے اندر سقم ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ کی جو سہولتیں پیدا کی تھیں ہم نے ان کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ ہم نے ان میں بے جا سختی اور تکلف کو داخل کر کے ایک حد تک شادی کو زندگی کا روگ بنا دیا ہے جس کے گھر ایک لڑکی پیدا ہو جائے اس کے لیے اس لڑکی کی شادی کے اخراجات برداشت کرنا اور عزت کے ساتھ اس دشوار گزار گھائی سے پار اتر جانا جان جو کھیل کا کام ہو گیا ہے۔ ایک مرد کو بیوی لاکر گھر بنانے اور نئے



پیشوں کے حق ادا کرنا جتنا مشکل ہے، اُس کا اندازہ کچھ اہل دل ہی  
 کر سکتے ہیں۔ رشوت ستانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملازم پیشہ لوگ  
 اپنی بیگمات کے مطالبات کو جائز ذرائع سے پورا ہی نہیں کر سکتے۔  
 ان تقاضوں کی وجہ سے شادی کا مناسب وقت ہو چکنے کے  
 باوجود اس رسم کے سرانجام دینے میں غیر معمولی التوا پیدا کرنا ناگزیر ہو گیا  
 ہے اور اس عبوری دور میں جوان آدمی کیا کچھ نہیں کرتا جب اس کے  
 چاروں طرف دعوت نظارہ، صنم کدے رقصاں ہوتے ہیں۔ وہ اس  
 رقص کی داؤد بے گاتو اور کیا کرے گا۔ ایک شادی کے بعد بد قسمتی  
 سے یا حسن اتفاق سے مرد کی ضروریات اس قسم کی ہوں کہ وہ اس  
 شادی سے تسکین نہ پاسکتا ہو، نیز اُس کے لیے قانون نے شرافت  
 کے ساتھ قسمت آزمائی کی راہیں بند کر دی ہوں، تو وہ نہایت شریفانہ  
 روش اختیار کر کے گرل فرینڈز رکھ سکتا ہے۔ شبلیہ کلبوں میں داؤد عیش  
 دے سکتا ہے۔ چاہے اس عیش کے لیے اسے ڈاکہ ڈالنے کی  
 ضرورت پیش آئے، یا ایک فردشی کا کاروبار چلانا پڑے۔ اس کے  
 اس طرز عمل کو موجودہ سوسائٹی ناپسند نہیں کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ  
 اُسے آزاد منش جوان قرار دیا جائے گا اس کے برعکس اگر وہ دوسری بیوی  
 گھر لے آئے۔ تو اس کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔



اس مذہب کو جو دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے۔ وقتاً تو سی قرار  
 دینے میں ایڑھی چوٹی کا زور لگا یا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے  
 کے حالات ایسے ہوں اور جس نظام میں بدی کرنے کی سہولت اس  
 درجہ ہو اور نیکی کے راستے میں کانٹے اور اوگھٹ گھاٹ پنا پڑتی ہوں  
 وہاں خیر و شر کی حکمت میں الجھنا ناوانی نہیں تو اور کیسا ہے !  
 کہا جاتا ہے کہ معاشی حالات کی رو سے بھی اب ایک مرد کے  
 لیے ایک سے زائد بیویاں رکھنا درست نہیں رہا۔ لہذا ریاست  
 کو اس پر پابندی لگانے کا حق حاصل ہے۔ گویا پابندی یا اجازت  
 کی اساس معاشی حالات پر ہے۔ فرض کیجیے کل معاشی حالات ایسے  
 ہو جائیں کہ ایک مرد کے لیے ایک بیوی کا رکھنا بھی مشکل ہو جائے  
 تو کیا اس وقت اس قسم کا ریاستی اجتہاد جائز ہوگا کہ دو مرد یا تین مرد  
 مل کر ایک عورت رکھ سکتے ہیں یا سرے سے شادی کی ہی ضرورت  
 نہیں ہے۔ آزادی کا زمانہ ہے جس کا جدھر سے جی چاہے اپنی  
 تسلی کے سامان پیدا کرتا پھرے۔ مرد بھی ریاست کے ہیں عورتیں  
 بھی ریاست کی ہیں۔ تو کیا ایسا اجتہاد جو حالات کے دباؤ کے زیر اثر  
 کیا جائے، اسلامی اجتہاد ہوگا اور ایسی تعلق داری اسلامی نکاح والی  
 تعلق داری کہا سکے گی؟ الامان! الامان!



اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے نقصانات  
**شراب** اس کے فوائد سے بڑھ کر ہیں، ہر نشہ آور شے اس  
 حکم کی رو سے حرام ہے۔ گویا حرمت کی علت غائی نشہ آور ہی ہے  
 کیونکہ نشہ کی بدستی میں اسلامی اقدار کی برقراری جاتی رہتی ہے اور  
 اخلاق کے وفترے ناب میں عرق ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک  
 شرابی کو اگر شراب نشہ نہ دے اور وہ چنی کر بھی بے حال نہ ہوتا ہو،  
 تو شراب حرام نہیں رہتی، یہ تو اس کے لیے حرام ہے جو چنی کر آپے سے  
 باہر ہو جائے۔ نیز جدید طب اس کے استعمال کو اچھا قرار دیتی ہے  
 اگر ہم نے دو ایک گھونٹ پی لیں تو کیا شور و شر ہے، ملا لوگ مفت  
 کا جھگڑا کرتے ہیں۔ تمام ترستی یافتہ قومیں شراب پیتی ہیں، کیا ان شرابیوں  
 کی بدولت یا دوسری اقوام کی روش کی سند لاکر شراب کو جائز اور  
 حلال کر دیا جاسکتا ہے؟ کیا ایسا فیصلہ اسلامی طرز فکر کی ہمنوائی کر سکتا  
 ہے؟

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے یعنی نص قطعہ کی رو سے اس کا  
**سود** لینا دینا حرام ہے۔ اقتصادیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ سود ہی  
 کاروبار کے بغیر ہمارے کام ہی نہیں چل سکتے۔ حکومت کا چلانا ہی  
 مشکل ہو جاتا ہے، بنک بند ہو جاتے ہیں اور نظام درہم برہم ہو جاتا



ہے۔ کچھ عرصہ پہلے مصر کے علمائے کرام نے کافی بحث و مذاکرہ کے بعد  
 بیکیپینسپول کی پالیسیوں کی خاص صورتیں اس لیے متعین کرنے کی  
 سفارش کی تھی، کہ اس طرز عمل سے سوڈا کا احتمال نہیں رہے گا۔ مگر  
 اس کے باوجود وہاں کے اجتماعی اسلامی ضمیر نے اس تبدیلی کو پسند  
 نہیں کیا اور سوڈی کاروبار بدستور سوڈی کاروبار رہے اور اس کا ناجائز  
 ہونا بدستور ناجائز ہے۔

ہمیں اپنے نظریات اور احکام کی روشنی میں بینک کاری کے جدید  
 طریقے اختیار کرنے چاہئیں اور ماحول کے دباؤ سے سوڈو کو جائز نہیں  
 قرار دینا چاہیے جس کی حرمت نص کی رو سے ہو اس میں تبدیلی کا حجاز  
 کوئی نہیں ہے۔

زندگی کے متغیر حالات اور قانون سازی | اقبال نے ان خطبات  
 ساتھ زندگی کے تغیر پذیر حالات کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے تقاضوں  
 کا قانون سازی سے جو تعلق ہو سکتا ہے۔ اس کی بول و صاحت کی  
 ہے۔

دو لیکن پھر اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطلع نظر ہے۔  
 جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود



کی بجائے حرکت پر رہیں۔ لہذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مضمون نظر ایسا ہوگا  
 اس کی روش ارتقا کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ ہمیں نہیں  
 بھولنا چاہیے تو یہ کہ زندگی محض تخیری نہیں اس میں حفظ و ثبات کا  
 ایک عنصر بھی موجود ہے، بات اصل میں یہ ہے کہ انسان جب اپنی تخلیقی  
 فعالیت سے لطف اندوز ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے  
 نئے نئے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اپنے انکشافِ ذات سے  
 آپ ہی بے چین ہو جاتا ہے۔ لہذا اس پر محض آگے ہی آگے بڑھنے  
 والی حرکت میں وہ اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ اسے اپنی  
 وسعت ذات سے خوف اور وحشت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ  
 دیکھتا ہے کہ اس پیش رس حرکت میں روح انسانی کو بعض ایسی قوتوں  
 سے سابقہ پڑتا ہے جو اس کا راستہ روک لیتیں اور مخالف سمت  
 میں کام کرنی نظر آتی ہیں۔ مگر پھر بھی اس بات کو ہم دوسرے لفظوں  
 میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی  
 ہے اس لیے ہمیں چاہیے جماعت میں تخیر و تبدل کا جو نقشہ ہم نے  
 قائم کیا ہے اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور  
 وظائف فراموش نہ کریں، تعلیمات قرآنی کی یہی وہ جامعیت ہے  
 جس کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید عقلیت کو اپنے اوارات کا جائزہ



یسنا ہوگا۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے قطع نظر نہیں کر سکتی۔ اس لیے  
 کہ یہ ان کا ماضی ہی تھا جس سے ان کی موجودہ شخصیت متعین ہوئی۔  
 پھر اسلام ایسے معاشرے میں تو پرانی تالیسیات پر نظر ثانی کا مسئلہ  
 اور بھی نازک ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کے مصلحین کی ذمہ داریاں بھی  
 ایک بڑی سنگین شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسلام کی حیثیت لاجعرا فی  
 ہے اور اس کا مقصد ہے ایک ایسا نمونہ پیش کرنا جو اتحاد و انسانی کی  
 اس شکل کے لیے جو بالآخر ظہور میں آئے گی مختلف بلکہ یہ کہنا چاہیے  
 باہم دگر حریت نسلول کو اول دولت ایمان سے مالا مال کروے اور  
 پھر اس منفرق اور منتشر مجموعے کو ایک ایسی امت کی شکل دے جس  
 کا اپنا ایک شعور ذاتا ہو۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بایں ہمہ  
 اسلام نے ان ادارات کے ذریعے جن کی تالیسیں میں بڑی حکمت سے  
 کام لیا گیا ہے۔ اتنی کامیابی تو ضرور حاصل کر لی ہے کہ اس کے  
 مختلف انجمنس پیروں میں کچھ نہ کچھ اجتماعی اروہ اور اجتماعی ضمیر پیدا ہو گیا  
 ہے، اس قسم کے معاشرے کے ارتقار میں تو بعض قواعد و ضوابط،  
 مثلاً آداب اکل و شرب یا احکام طہارت کا غیر تبدیل ہونا بھی جو اجتماعی  
 اعتبار سے بے ضرر ہیں۔ زندگی کے نقطہ نظر سے بڑا قابل قدر ہے  
 کیونکہ ان سے معاشرے میں ایک خاص قسم کا خلوص پرورش پاتا ہے



اور اس کے ظاہر و باطن میں ایک ایسی یکسانی اور یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے جو تفریق و انتشار اور عدم مجانسیت راہم جنس ہونے سے احتراز کرنا کی ان قوتوں کا سدباب کر دیتی ہے جو ایک مرکب اور مخلوط معاشرے میں خواہ پیدا رہتی ہیں۔ لہذا ان ادارات میں لاکھڑا سنے سے پہلے معتز ضیہ کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام نے اجتماع انسانی کو جو شکل دینے کی کوشش کی ہے اس کا معنی و منشا فی الحقیقت کیا ہے۔ وہ اس کی ہیئت اجتماعیہ پر نظر ڈالیں تو اس لحاظ سے نہیں کہ اس سے بیہیت، ایک معاشرہ کس ملک کو فائدہ پہنچتا ہے اور کس کو نہیں۔ بلکہ اس اعلیٰ مقصد کے پیش نظر جو ساری نوع انسانی کی زندگی میں رفتہ رفتہ اور بتدریج پورا کیا جا رہا ہے۔

تہکی کے شعاع مہیا ثے مساوات مرد و زن کے پیش نظر اسلام کے قوانین میں جو تبدیلی کرنے کی خواہش کی ہے اور علامہ نے اس کے افکار پر تنقید کر کے اسلام کے مجتہدین کی جن کامیابیوں کی توقع کا اظہار کیا ہے۔ اس کا بخور مرطالعہ کیے بغیر جیسا کہ گذشتہ اوراق میں لکھا گیا۔ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کی منصوص ہدایات میں کئی تغیر و تبدل کی گنجائش ہوگی لیکن جب ان



محولہ بالا سطور کو دیکھا جائے جن میں انھوں نے زندگی کے منتخیر حالات اور قدامت پسند قوتوں کے فوائد کا بیان کیا ہے تو یہ شک و شبہ دور ہو جاتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے علامہ کے پیروکاروں نے اس حصے کو نظر انداز کر کے ان کے صرف انہی نظریات کو اچھا لانا شروع کر رکھا ہے جن کی رو سے زندگی ہر لحظہ تخریر آتشنا ہو رہی ہے اور یوں نئے قوانین اور اصلاحات کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہے، اس طرح کا انداز فکر علامہ کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے اور صحیح طریق کار متعین نہیں ہو سکتا۔

بچیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ معاشی حالات کی تبدیلیاں تمام تر بیرونی اثرات و عوامل کی بنا پر معرض وجود میں نہیں آ یا کرتیں بلکہ اس قوم کے ان روحانی اور اخلاقی نظریات کو بھی ان تبدیلیوں کے لانے میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جو وہ زندگی کے بارے میں رکھتی ہے۔ اس نکتے کو نظر انداز کرنے سے کوئی خاطر خواہ اصلاح رونما نہیں ہو سکتی۔ اگر محض منتخیر حالات (سیاسی اور معاشرتی وغیرہ) کی لٹکار کو سن کر ہم اپنے قوانین میں تبدیلی کرنی شروع کر دیں گے تو ہمارے اسلام کی صورت مسخ ہو جائے گی اور ہم ہر حکم کو ہر قاعدے کو ہر امر کو ہر نہی کو محض وقتی سمجھ کر سارے نظام کو



تباہ و برباد کر دیں گے۔

کیا احکام وقتی ہیں؟ عملی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے جب کسی

جرم کی سزا جو نصوص قطعی سے مقرر ہو، حالات کے بدلنے پر بدل سکتی ہے، تو اس طرح قرآنی نصوص کی دوامی حیثیت بدل جائے گی اور اس طرح کی تخریف و تاویل سے کام لے کر جو قانون بنایا جائے گا۔ وہ کسی طرح بھی اسلامی نہیں کہلا سکتا جب اس کی شکل و صورت ہی بدل گئی تو اس کا تعلق خواہ مخواہ قرآن اور اسلام سے ملاینا کوئی فائدہ بخششات نہیں ہے۔

اب عبادات کو بھیجیے۔ بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا لحاظ کیجیے۔ زندگی کے بہتے ہوئے وھارے کی توہیں سے بچیے۔ ترقی اور سائنس کا منہ نہ چڑھائیے۔ مہذب دنیا کا ساتھ دیجیے۔ زندہ رہنے کے لیے عبادات کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ضروری اور بہت سے اہم کام لازمی ہیں ان کا حق بھی ادا کیجیے تو ان کی صورت مسخ ہو کر کیا سے کیا رہ جائے گی، مثلاً:

۱۔ کلمہ

۲۔ نماز



۴۔ روزہ

۲۶۔ حج

۵۔ زکوٰۃ

۱۔ کلمہ طیبہ کے دور کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ بھائیو! اس کے دو جزو ہیں۔ پہلے میں اللہ کی توحید کا اقرار ہے، دوسرے میں نبی کریم کی رسالت کا اعلان ہے۔ اب انسان جہالت کے زلمے سے نکل کر روشنی کے دور میں آگئے ہیں جب ایک بار ایک سمجھدار آدمی نے اس کلمہ کو پڑھ لیا تو اس کے بار بار دہرانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بس ایک بات معلوم ہو گئی اور ہم نے تسلیم بھی کر لی اب اس کا اعادہ کرنا کہ بہارِ ادماعِ خراب کرنا چاہتے ہو جدید نفسیات کی رُو سے بس اتنا کافی ہے کہ آدمی ایک دفعہ حتمی طور پر ایک بات کو تسلیم کر کے اس بات کو لا شعور کے حوالے کر دے۔ "چلو کلمہ سے تو چھٹی ہو گئی۔"

۲۔ نماز، "نماز کے اوقات کا تعین عرب کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل گئے۔ ضبطِ اوقات کے لیے نئے تقاضے اور نئی ضروریات کی رُو سے ایک صنعتی ملک کے لیے پنج وقتہ نماز کے لیے وقت نکالنا قومی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ڈالنا ہے



اسلام قوم کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ ترقی کا سبق دیتا ہے۔ تم تنزیل کی باتیں کرتے ہو۔ ہم صرف ایک دن میں ایک وقت کے لیے ایسا کر سکتے ہیں یعنی جمعہ کے دن۔ آخر قرآن نے تصریح کے ساتھ جمعہ کی اذان سن کر نماز کا حکم دیا ہے اور پھر اس حکم کے ساتھ فضل اللہ کی تلاش بھی تاکید لگا دی گئی ہے، موجودہ حالات میں فضل کی تلاش زیادہ اہم ہے اور نماز کے لیے وقت نکالنا اسراف ہے اور اسراف سے اسلام نے روکا ہے "چلیے نماز سے بھی نجات مل گئی۔"

جدید ترقی پسند مجتہدین کا گروہ جنہوں نے تجو ریلوں کی مدد سے اور ایک مارکیٹ کے فضل سے مجلس قانون ساز کی کنیت حاصل کر لی ہوگی۔ وہ نماز کے لیے ایک ایسی کتاب الدعاء Book of Modern prayer تصنیف فرمائیں گے جس کے چند اوراق کسی وقت بھی میٹھے بٹھائے، سفر ہو یا حضر، پڑھا لیسے جاسکیں اور یوں یہ فریضہ بھی ادا ہو جائے۔

علاوہ ازیں دوسرے فرائض کا بھی یہی حشر ہو سکتا ہے۔  
قارئین کرام۔ گذشتہ بحث کے مطالعہ کے بعد یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ گذشتہ اوراق میں فرائض کی صحیح صورت کسے قائم نہ رہنے کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض فرضی ہے، ایسا ہونا کیسے ممکن ہے؟



مسلمانوں کے ہاں جو فرائض تو اتر کے طور پر ادا ہو رہے ہیں، ان میں تبدیلی کیسے ہو سکتی ہے؟ حدیث کے منکرین تو فروعی معاملات میں دخل اندازی کے قائل ہیں وہ اساسی اور بنیادی باتوں میں دخل کب دیتے ہیں؟

اہم اس سوال کے جواب کے لیے منکرین حدیث کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور ان کی ان نگارشات کا حوالہ دیں گے جو دین کی اساسی باتوں سے متعلق ہیں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے منہ موڑا جاتا ہے تو قرآن سے ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ (تفصیل انکار حدیث کے چار نقیب میں ملاحظہ ہو)

امرئسر کا ایک مشہور مہفتہ وار اخبار لکھتا ہے:

(انکار حدیث کے ابتدائی علم بڑاوں کی نیت آئندہ سوالوں سے بے نقاب ہوتی ہے)

## احادیث پر حکم اور اس کی مدافعت

مسلمانوں کے کل فرقے قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف کو حجت شرعی مانتے ہیں، سب سے بڑا اختلاف شیعہ سنی کا ہے،

۲۵ اگست ۱۹۲۲ء یوم جمعہ المبارک



اس سے کم اور بہت کم مقلدین اور اہل حدیث کا ہے۔ مگر حدیث کی تسلیم میں یہ سب متفق ہیں باوجود سب کی تسلیم کے جماعت اہل حدیث خصوصیت سے ذمہ دار ہے، کیونکہ ان کا دعویٰ ہے:

ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار

مت دیکھ کسی کا قول و کردار

اس لیے دشمن منکر حدیث کے حملے کو روکنے میں سب فرقے شریک ہوں گے۔ لیکن اہل حدیث اپنی ذمہ داری کی وجہ سے ان سب سے پیش پیش ہونے چاہئیں۔ یہیں نے اس لیے کہا ہے کہ جماعت اہل حدیث اپنا فرض محسوس کرے۔

ہندو پاکستان میں سب سے پہلے سر سید احمد خاں نے حدیث کی حیثیت شرعیہ ہونے سے انکار کیا مگر احکام حدیثیہ (ہدیت نماز وغیرہ) کو تو اتر کی صورت میں تسلیم رکھا۔ ان کے بعد پنجاب میں مولوی عبدالقدیر چکڑالوی نے اس کو کھلم کھلا موضوع بحث کا مقرر کر دیا جس کے ذریعہ کے لیے علماء حدیث متوجہ ہوئے۔ چنانچہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے لاہور میں چکڑالوی صاحب سے بالمشافہہ اتباع رسول پر بحث کی اور اس خاکسار نے بھی زبانی گفتگو کے علاوہ متعدد تحریرات بھی شائع کیں۔ آج کل ایک کتاب "شریعت الحق" پٹنہ سے شائع ہوئی ہے اور



دوسری ”مہفوات المسلمین“ حیدرآباد سے نکلی ہے۔ مصر میں بھی ایک جماعت اس خیال کی پیدا ہو گئی۔ امرتسر خاص میں ایک صاحب اس خیال کے ہیں جو حدیث نبوی کو حجت شرعیہ نہیں مانتے اور اپنے گرونیواریں میں اس کی اشاعت کرتے ہیں بوجہ معاشرت اور بوجہ شہریت، اسباب کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ ان امرتسری صاحب کے ساتھ شریفانہ طریق سے تباہ کن خیالات یا مناظرانہ رنگ میں کچھ پرچہ نویسی ہوئی قرار پائی۔

میر اور میرے اصحاب کا تقاضا یہی تھا کہ ایک جگہ بیٹھ کر بالمشافہ پرچہ نویسی ہو۔ مگر فریق ثانی نے ایسا کرنے میں اپنے آپ کو معذور بتایا چونکہ صحیح معنی میں حق شہریت ادا کرنا مقصود تھا۔ لہذا تسلیم کیا گیا کہ ہر کوئی اپنے اپنے مکان سے جب کبھی ہو سکے پرچہ فریق ثانی کو بھیج دیا کرے چنانچہ آج (۱۶ اگست) تک ایک پرچہ آیا اور ایک گیا۔

جتنے آلات علمی سے حدیث پر حملہ ہو سکتا ہے۔ اس بحث میں وہ سارے آلات استعمال ہوئے گئے۔ اس لیے ناظرین تک اس حملے کی اطلاع کرنا میرا اسی طرح فرض ہے جس طرح سرحدی افسر کا فرض ہے کہ دشمن کی ہر طرح کی تیاری کی اطلاع مرکزی حکومت کو کرتا رہے، تاکہ حکومت اس حملہ کے دفعہ کرنے پر تیار ہو سکے۔

اس کے بعد امرتسری صاحب (منکر حدیث) کا پرچہ اول درجہ کیا جانا



ہے جس کا اوپر بندہ کیا گیا تھا:  
پرچہ اول

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

مخدوم و مکرم بندہ جناب مولوی ثنا اللہ صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اندریں ایام آپ کی بار بار تحریک کے بعد کمترین نے تحریری بحث کے لیے رضا مندی ظاہر کی جسے آنجناب نے ازراہ نوازش منظور فرمایا اب کمترین حسب الحکم آنجناب کے پہلا پرچہ ارسال خدمت کرتا ہے۔  
و۔ حق منشائر الہی کا نام ہے کسی مخلوق کا منشائر مطابقت خوائے ربی کی ضروری شرط کے بغیر اپنے آپ میں ہرگز ہرگز حق نہیں ہو سکتا حق کی دریافت کے دو طریقے ہیں۔ ایک وحی الہی۔ دوسرے عقلی ذرائع ان دونوں میں بہتے بہتے بڑے بڑے فرق ہیں۔

اول: وحی الہی صرف تصرف الہی سے ہوتی ہے اس میں کسی انسان کی عقلی و اختیار کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لیے وحی کی اطاعت حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے عقلی ذرائع سے بھی اگرچہ الہی منشائر کی ہی پیروی مقصود ہوتی ہے مگر چونکہ ان میں بشری عقل و اختیار کا

۱۲۹  
بسم اللہ  
الحمد لله  
وسلام على عباده  
الذين اصطفى  
مخدوم و مکرم  
بندہ جناب مولوی  
ثنا اللہ صاحب  
السلام علیکم  
ورحمۃ اللہ  
وبرکاتہ



داخل ہوتا ہے اس لیے وہ ان داناؤں کی بھی اطاعت ہوتی ہے جن کی سعی و اجتہاد سے وہ علوم دریافت ہوئے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمام اطاعت و راصل خدا تعالیٰ کے لیے ہی ہے۔ مگر وحی کی اطاعت خاص خدا کی اطاعت ہے اور جس اطاعت میں بشری عقل و اختیار کا دخل ہوتا ہے، صرف وہی اطاعت ٹھیک طور پر بشری اطاعت کہلا سکتی ہے۔

دوم: عقلی ذرائع کے ساتھ ہم خدا کے کاموں سے قیاس کر کے اس کا منشا و دریافت کرتے ہیں لیکن وحی کے ذریعہ سے خود خدا اپنا منشا ہم کو آپ ہی بتلا دیتا ہے۔ وحی کا حکم یقینی ہوتا ہے لیکن عقلی باتوں میں غلطیاں بھی ضرور ہوتی ہیں پس خدا تعالیٰ کی خاص اطاعت صرف وحی کی اطاعت ہے۔

سوم: وحی کے ذریعہ سے جو علوم ملتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے صحیح ہوتے ہیں۔ لیکن بشری عقل چونکہ محدود ہے اس لیے اس کے معلومات ہمیشہ درمیش بدلتے رہتے ہیں اور بحیثیت مجموعی بہتری کی طرف ترقی کر جاتے ہیں۔ عقلی فیصلے مختلف اوقات میں مختلف بھی ہو سکتے ہیں، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی بے تخریط اطاعت صرف وحی کی اطاعت ہی ہے۔



اللہ تعالیٰ کی طاعت اور مخلوق کی اطاعت ہرگز ہرگز ایک ہی طرح کی نہیں ہو سکتیں۔ خدا تعالیٰ کی اطاعت وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے کے لائق ہے اور مخلوق کی اطاعت وہ ہے جو مخلوق کے لائق ہے۔ رسول بھی مخلوق ہی ہوتے ہیں پس اللہ اور رسولوں کی اطاعت میں بھی وہی فرق ہونا لازم ہے جو خالق و مخلوق کی اطاعت میں ہونا ضروری ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے غنی کرنے اور رسول کے غنی کرنے میں، اور اللہ کے شکر اور ماں باپ کے شکر میں، اور اللہ کے تقویٰ اور ارحام کے تقویٰ میں، اور اللہ کی ولایت اور رسول کی ولایت میں، اور اللہ کی مدد اور مومنوں کی مدد میں فرق ہے۔ ہو بہو وہی فرق اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت میں ہے۔

۱۳۲ قرآن مجید رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کو دوسرے بشروں کی مثل ہی بیان فرماتا ہے۔ پس آپ ضرور بشری عقل و اختیار رکھتے تھے۔ اور آپ کی بھی بشری عقل و اختیار والی باتیں تھیں جس طرح ہم وحی الہی کے محکوم ہیں، آپ بھی تھے جس طرح ہم آپ سے عقلی و اختیاری کاموں میں جوابدہ ہیں، آپ بھی تھے۔ اِنَّ لَدٰىكَ وِلٰيٰتُنَا وَ سَوْفَ نَسْئَلُكَ فَرْمٰنًا سَعٰدًا۔ اور ما تحت سوال تھے وہ پہلے سے ہی وحی الہی



کیسے قرار پا سکتے ہیں۔ آپ کو مشوروں سے پختگی حاصل کرنے کا حکم تھا کہ کسی کام کے کل کرنے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہنے کے نہ کریں۔ آپ نہیں جانتے تھے کہ کل کیا ہو جاتا ہے۔ آپ کو شیطانی نزع کے وقت اعوذ باللہ کی دعا کرنے کا حکم ہے۔ آپ شیطانی بہرات سے پناہ بھی مانگا کرتے تھے۔ آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنے گناہ کی بخشش مانگ ! حاصل یہ ہے کہ بالیقین آپ کی ایسی باتیں تھیں جو وحی کے بغیر تھیں اور آپ عقل و اجتناب و دشوری سے ضرور ہی کام لیا کرتے تھے۔

(۳) لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ایسی عقلی ذرائع والی اطاعت دین میں ضروری نہیں، بلکہ دینی معاملات کا انحصار بہت کچھ عقلی ذرائع پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان عالی شان "واہم شورا ہیٰ بینہم" کے مطابق مومنوں کو اپنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔ خود رسول خدا کو بھی مشورہ کرنے کا حکم تھا پس مشورہ کی مخالفت اس کے پکے ہونے کے بعد کرنا خلاف منشا سے الٰہی یعنی گناہ ہے۔ اور اس کی متابعت ثواب اور نیکی ہے۔

محرم اگر کسی جانور کو مار ڈالے تو اس کا کفارہ دو عدل والے منصفوں کے فیصلے سے مقرر ہوگا جس کا مانتا دینی فرض ہوگا۔ یہی حال "حکماً" مِنْ اٰھْلِہِمْ وَحَکْمًا مِنْ اٰھْلِہَا کا بھی ہے۔ ادنیٰ عدالتوں کے



فیصلوں کی اپیل اعلیٰ عدالت میں ہو سکتی ہے۔ مگر اعلیٰ عدالت کے  
 آخری فیصلہ کو اگر نہ مانا جائے تو فرمائیں کہ کیا کیا جائے، اگرچہ اعتقاداً  
 ان کو غلط بھی سمجھا جائے مگر عملی تسلیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہو سکتا  
 یہی حال تمام دیگر عقلی ذرائع کا بھی ہے۔ اس سے صاف کھل جاتا  
 ہے کہ عقلی ذرائع والی اطاعت بھی دین میں از بس ضروری ہے۔ ہمارا  
 دعویٰ ہے کہ وحی کی ضرورتوں کے مطابق جس قدر قطعی واجب الاتباع  
 وحی اور کار کھنی۔ وہ کامل و اکمل طور پر قرآن مجید میں جمع کر دی گئی ہے۔ باقی  
 ضروریات عقلی ذرائع پر چھوڑی گئی ہیں، تاکہ عقلی ذرائع اور صحیفہ مرفطرت  
 فضول اور نکتے نہ ہو جائیں۔ نہیں نہیں بلکہ ہم وحی کے ماتحت چل کر  
 عقلی ذرائع سے ان لوگوں کی نسبت بہت زیادہ ترقیات کر سکتے ہیں  
 جو محض عقل پر چلتے ہیں۔ پھر جو باتیں قرآن مجید نے عقلی ذرائع پر چھوڑ  
 دی ہیں ان میں رسول خدا بھی اپنی بشری عقل سے بالضرورت کام لیتے تھے

پس آپ کی معقول باتوں سے فائدہ نہ اٹھانا ظلم صریح ہے جب

قرآن مجید احسن اور اہدیٰ بات کی پیروی کی تاکید فرماتا ہے تو کیا اپنے نبی

کی ہی عقل سے مستفید اور مستفیض نہ ہونا صریح کفر ان نہیں ہے؟

حدیث بختیہ معقول و احسن و اہدیٰ ہونے کے ہماری بھی ہے نہ

بختیہ وحی کے۔



(۴) حاصل یہ ہے کہ ہمارے غلط اور بے تغیر اصول صرف وحی الہی ہی ہو سکتا ہے اور بس۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس وحی الہی کی تلاش کے لیے ہمیں در بدر مارے مارے پڑے پھرتے رہنا چاہیے؟ اور کیا کہیں ٹورانٹ کو، اور کہیں انجیل کو، اور کہیں زبور کو، اور کہیں ملت و صحف ابراہیمؑ کو اور کہیں دوسرے انبیاء کی کتب کو اور کہیں ان انبیاء کی حدیثوں، اور کہیں بخاری کو، اور کہیں مسلم کو، اور ابو داؤد کو، اور کہیں نسائی کو، اور کہیں ابن ماجہ کو، اور کہیں ترمذی کو، اور کہیں موطا امام مالک کو، اور کہیں دوسرے اماموں کی مسندوں کو، اور کہیں اسماء الرجال کی کتابوں کو ڈھونڈتے پھرنا چاہیے؟ اور پھر باوجود اس کے بھی تمام الہی وحیوں کے مل جانے کا کبھی بھی پورا یقین حاصل نہ ہو، یا کیا یہ مناسب ہے کہ خدا تعالیٰ خود ہی رحم فرما کر ضروری وحیوں کا ایک ہی دستور العمل تیار کر کے ہمیں دے دے، جو اکیلا ہی ہمارے لیے کافی ہو اور وحیوں کی تلاش کی مالا بلاق تکلیف سے ہم کو نجات ہی دے دے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن مجید کی صورت میں خدا تعالیٰ نے یہ رحمت پورے طور پر ہم پر نازل فرمادی ہے۔ یہ بات اپنا آپ ہی ثبوت ہے۔ مگر مزید تسلی کے لیے ہم چند ایک اور دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔

(۵) قرآن مجید کی صورت ہی ایسی ہے جو صاف ظاہر کرتی ہے کہ



یہ کتاب کریم تمام انبیاء اور حکماء کی کتابوں کا عطر مجموعہ ہے۔ قرآن کریم تمام الہی کتابوں کی تصدیق فرماتا، اور پہلے لوگوں کی سنتوں کی ہدایت کرتا ہے، اور ان کی پیروی کی تاکید فرماتا ہے۔ قرآن مجید یہ تصدیق ان کتابوں اور سنتوں کو اپنے میں لے کرتا ہے۔ ان کا مستقل وجود قائم نہیں رہنے دیتا۔ ہو ہوا اسی طرح قرآن مجید رسول اللہ کی لائف کے تمام ضروری حالات اور واقعات اور افعال و اقوال کو اپنے میں شامل کر لیتا ہے جنگ بدر و احد و احزاب و حشر و حنین وغیرہ کو ان کے واقع ہونے کے بعد بھی قرآن میں لانا ضروری سمجھا گیا۔ حدیث میں ہی رہنے دینا کافی نہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح نکاح نہیبت، مقدمہ سورہ نسأ اور منافقین کے بارے میں صحابہ کی دو پارٹیاں بننے کا ذکر بھی بعد از وقوع قرآن میں لانا ہی ضروری قرار پایا۔ تقسیم میراث، نکاح و طلاق۔ حرام و حلال عورات، حرام و حلال مطعومات، غسل و وضو، اور دیگر روزمرہ کی ضروریات کا جو بالیقین پہلے بھی کسی نہ کسی رنگ میں عمل میں آتی تھیں، بیان قرآن میں داخل کرنا لازم سمجھا گیا۔ رسول خدا کے گھر بار کے حالات تک بھی قرآن میں لائے گئے۔ یہ سب کس لیے کیا گیا؟ کیا حدیثوں کا استقلال قائم رکھنے کو؟ اگر حدیثیں حفاظت الہی میں رکھنے کے قابل مستقل اصول سمجھی جائیں، تو یہ باتیں حدیثوں میں رہ کر بھی ویسی



ہی قابل سند ہو سکتی تھیں ان کو قرآن میں لانے کی کوئی مرید ضرورت نہ تھی۔

(۶) اگر حدیثیں بطور وحی الہی کے کفار کے آگے پیش کر دی جاتی تھیں تو کیوں انھوں نے کبھی قرآن مجید کی مانند حدیثوں کے وحی ہونے کے متعلق بھی جھگڑے اور اعتراض نہیں کیے؟ کفار غیر قرآن کو تو خود مانگتے تھے وہ قرآن کے ہی بدلنے پر زور دیا کرتے تھے۔ منافق بھی سورتوں کے ہی نازل ہونے سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ حدیثیں ہر وقت سامنے ہوا کرتی تھیں۔ مومن بھی سورتوں کے اترنے کا خیال کیا کرتے تھے، ایک دفعہ کچھ عرصہ کے لیے قرآن مجید کی وحی رُک گئی لوگوں نے قرآن کے رُکنے کو رسول خدا کے منزوک و مبغوض الہی ہونے کے برابر سمجھا، حالانکہ حدیثوں کا وقوع اس وقت بھی ہوا تھا۔ وہ وقوع انھیں منظور الہی ٹھہرانے کو کافی نہ ہوا۔ پھر قرآن مجید تکلیف دہ باتوں کے متعلق سوال کرنے سے روکتا ہے اور خوف و لاتاب ہے کہ اگر قرآن کے نازل ہوتے وقت ان کا سوال کیوں کیوں نہ ہو ضرور تم کو جواب مل جائے گا۔ اب اگر حدیثیں بھی وحی سے ملتی تھیں تو کیوں ان سوالات کے جواب کو قرآن کے نزول کے ساتھ ہی وابستہ کیا گیا۔

(۷) کفار اعتراض کرتے تھے کہ کیوں یہ قرآن ایک ہی دفعہ سارے



کا سارا نازل نہیں کیا جاتا۔ اس کے جواب میں کئی دلائل بیان فرمائے:

اول: یہ کہ اس سے مصائب کے اوقات میں رسول خدا کے دل کو قائم رکھنا مقصود ہے اور ظاہر ہے کہ اگر اکٹھی ایک ہی وقت میں تمام تسلیاں دے دی جائیں، تو وہ ساری زندگی کے لیے کافی نہیں ہو سکتیں۔ یہ جواب ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اور حدیثی ذریعہ آپ کے دل کو قرآن کی طرح قائم رکھنے والا موجود ہوتا۔

دوم: یہ کہ قرآن پر جو اعتراض و سوال ہوں ان کے قرآن میں ہی جواب دیے جائیں۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ اگر قرآن جیسا کوئی اور ذریعہ جواب دینے کا موجود تھا۔

سوم: یہ کہ قرآن کی ضروری تفسیر بھی ساتھ ساتھ ہی ہوتی جائے۔ یہ جواب بھی صحیح نہیں ٹھہرتا۔ اگر قرآن جیسی وحی والی تفسیر کرنے کو کوئی اور ذریعہ رسول خدا کے پاس تھا۔

(۸۱) قرآن مجید کی تبلیغ رسول خدا پر ایسی فرض تھی کہ چلتی تلواریں بھی اسے نہیں روک سکتی تھیں، لیکن حدیثیں صرف حیا ریاد و بھونٹی کے خیال سے بھی روکی جا سکتی تھیں۔ رسول خدا کے گھر میں عزیز لوگ کھانا کھانے آیا کرتے تھے، وہ پکنے سے پہلے اب بیٹھتے تھے، اور کھانے کے بعد



حدیثوں کے پانچ میں لگے بہتے تھے۔ اکثر لوگوں کی ایسی ہی عادت ہوتی ہے۔ رسول خدا کو ان کے اس فعل سے اذیت ہوتی تھی۔ اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع کر دیتے تو یہ بالکل بجا ہوتا۔ مگر آپ حیار کے سبب ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے جب یہی بات قرآن مجید میں نازل ہو گئی تو اس وقت اسی بات کے بیان سے فُہی حیار آپ کو ہرگز نہ روک سکی۔ فاعتبدو یا اولی الابصار (۹) قرآن مجید کے متعلق تَحَدّی فرمائی گئی کہ اس کی مثل ایک سورت بلکہ ایک حدیث اسی سے آؤ۔ یہ تَحَدّی صرف عبارت آرائی میں ہی نہیں بلکہ زیادہ تر ہدایت میں ہے۔ جو قرآن مجید کا مقصود اصلی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو فرماتا ہے کہ ”تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو تورات اور قرآن سے زیادہ ہدایت والی کوئی الٰہی کتاب لاؤ۔ میں اس کی پیروی کروں گا۔“ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حدیثیں اس وقت بھی قرآن کی مثل نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ بلکہ تورات کا درجہ بھی نہیں رکھتی تھیں۔ رسول خدا فرماتے ہیں کہ اگر یہ قرآن میں نے اپنے دل سے بنا لیا ہے، تو تم بھی جو میرے جیسے بشر ہو۔ اس کی مانند بنا لاؤ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے سوائے رسول خدا کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو دوسرے بشر حاصل نہیں کر سکتے تھے۔



(۱۱۰) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ لیکن،  
 حدیثوں کو راپوں کے چھوٹ پر چھوڑ دیا ہے۔ اگر حدیثیں داخل قرآن  
 ہوتیں تو مثلیت و حفاظت قرآن میں بھی داخل ہونی لازم تھیں۔ رسول خدا  
 سے ہمارے پاس کوئی چیز سوائے قرآن کے الٰہی حفاظت کے ساتھ  
 نہیں پہنچی۔ اگر حدیثیں قرآن مجید کی طرح ہمیشہ کے لیے مقصود اور  
 ضروری التسلیح ہوتیں تو ضرور قرآن مجید کی طرح ہی پہنچائی جاتیں :  
 زیادہ سلام مع الاکرام

دستخط: کتیرین احمد الدین بقلم خود۔ مورخہ ۸ اگست ۱۹۲۲ء  
 آج سے چالیس سال قبل کے ان اعتراضات کا مقابلہ طلوع اسلام کے ڈاکٹر عبد الودود  
 صاحب کے اعتراضات سے کیجیے ان میں کتنی مطابقت ہے۔

## جواب پرچہ اول

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت مولوی احمدین صاحب امرتسری

وعلیکم السلام

مجھے مختلف ذرائع سے اطلاع ملتی رہی ہے کہ آپ حدیث نبوی  
 کے منکر ہیں چونکہ میں حدیث نبوی کو دین الٰہی سمجھتا ہوں اس لیے میرا



فرض ہے کہ میں کسی مسلمان کی نسبت منکر حدیث ہونا سنوں تو حق  
 خدمت ادا کروں، اس لیے میں نے آپ کے اجاب سے کہا تھا کہ  
 باہمی تباہی خیالات ہو جائے مگر انھوں نے تقریری تو کیا بالمشافہ  
 تحریر کی منظوری بھی آپ کی جانب سے نہ دی تو آخر کار میاں مولانا بخش  
 صاحب کی وساطت سے طے پایا کہ اپنے اپنے مکان سے پرچہ آجایا  
 کرے۔ یہ بھی انھوں ہی نے کہا تھا کہ پہلا پرچہ آپ کی جانب سے ہوگا  
 چنانچہ آپ نے بھیجا جس کا میں جواب بھیجتا ہوں۔

آپ کے پرچہ پر مفصل بحث کرنے سے پہلے میں اپنا عقیدہ و بارہ  
 حدیث لکھ دینا ضروری جانتا ہوں، کیونکہ بوساطت میاں مولانا بخش صاحب  
 موصوف یہ قرار پایا تھا کہ:

”بحث حجیت حدیث پر ہوگی“

میں اور قائلین حدیث نبوی حدیث کی نسبت وہی اعتقاد رکھتے ہیں جو  
 امام شافعیؒ نے اظہار کیا، تو اسے:

كُلُّ مَا حَكَمَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ فَهُوَ مِمَّا فَهَمَ مِنْ  
 الْقُرْآنِ (اتقان، سیوطی)

جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، قرآن سے ہی  
 سمجھ کر دیا ہے۔



جس کو حافظ ابن قیم مرحوم نے زاوالمعاد میں مفصل بیان کیا ہے اس عقیدے کا ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کا بیان کرنا اپنے ذمہ لیا ہے ارشاد ہے:

إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنُهُ ثُمَّ إِنَّا عَلَيْنَا بَيَانُهُ

ہمارے (اللہ کے) ذمہ ہے قرآن کا بیان کرنا۔

اسی فرض الہی کو دوسرے مقام پر لیل ارشاد فرمایا ہے:

أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ  
وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

اے نبی! قرآن ہم نے تم پر اس لیے اتارا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے بیان کر دے جو ان کی طرف اترا ہے تاکہ وہ فکر کریں۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ قرآن کا بیان کرنا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض قرار دیا ہے اور سابقہ آیت نے اس بیان کو فرض الہی بیان فرمایا ہے۔ ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا قرآن کو بیان کرنا کسی عالم یا مجتہد کے بیان کی مثل نہیں جیسا آپ نے فقرہ ۳ میں لکھا ہے، بلکہ یہ بیان، بیان الہی ہے۔

اس کی مثال آج کل کی اصطلاح میں ریل ملتی ہے کہ قانون سازی، لیجسلیٹو کونسل کا کام ہے، ہائیکورٹ کا کام قانون سازی نہیں، مگر



جس قانونی دفعہ پر مانی کورٹ کسی صورت میں فیصلہ کر دے۔ تو تمام صوبہ کے لیے وہ فیصلہ مثل قانون کے نافذ ہوتا ہے اور اگر پریوی کونسل کے حج کسی جانب اسے قائم کر دیں تو سارے ممالک محروسہ کے لیے حجت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ فیصلہ قانون نہیں بلکہ قانون کی تشریح اور حسب قانون فیصلہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثنا کو قرآن کے ساتھ نسبت خاص ہے۔ اس لیے حدیث نبوی کے احکام کو

خدا تعالیٰ نے احکام الہیہ میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

الْمُتَدْرِي إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ  
وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ ط

اے نبی! آپ نے ان لوگوں کو دیکھا جن کو کہا گیا کہ جنگ سے ہاتھ

بند رکھو اور نماز پڑھتے رہو۔

اس آیت میں جو کُفُّوا کا حکم ہے۔ یہ قرآنی احکام میں نہیں ملتا پھر اس کو حکم واجب الاتباع قرار دے کر الزام کیوں لگایا گیا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ زبان نبوت کا ارشاد تھا جو حکم الہی کے برابر قرار دیا گیا۔ اللہ اعلم

دو کسر مثال اس کی یہ آیت ہے !  
مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا

جس قبلہ رحمت المقدس پر تو اسے نبی تھا ہم نے اس کو اس لیے مقرر کیا



تھا کہ تابعین حکم نہیں دیتے بلکہ ان کو غیر تابعین سے جدا کر دیں (بقدرہ)  
 اس آیت میں جَعَلَ کا مفعول بہ "القبلة" کو بنا یا ہے اور  
 جَعَلَ فعل الہی بنا یا ہے۔ حالانکہ مجہد ناقص العلم کو قرآن مجید میں ایسا کوئی  
 فقرہ نہیں ملتا جس میں یہ حکم ہو کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھو جس  
 سے اس حکایت کا محکی عنہ مل سکے۔ آپ قرآن مجید میں ان احکام کی تلاش  
 میں کامیاب ہو جائیں تو میں آپ کی اطلاع پہنچنے پر مشکور ہوں گا۔

اب میں ایک دو مثالیں قرآن اور حدیث کی بیان کرتا ہوں جن سے  
 یہ نسبت متعین ہو سکے، قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْعَظِيمِ : سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْعَلِيِّ پہلی آیت کی نسبت حضور نے فرمایا  
 اس پر کوئی عمل کرو اور دوسری کی بابت فرمایا اس پر سجدے میں عمل کرو چنانچہ  
 ایسا ہی ہوتا ہے مقام خور ہے کہ اس ارشاد نبوی سے کیا مفہوم ہوا پس  
 یہی کہ اس حکم کے مختلف محلوں میں سے ایک محل واجب العمل معین فرما  
 دیا:

اسی طرح حرمت میں خنزیر کے ساتھ کتے کو ملحق فرما دیا۔ ورنہ قرآن مجید  
 میں کتے کی حرمت کے لیے کوئی خاص حکم نہیں۔ شاید آپ تلاش میں  
 کامیاب ہو جائیں۔

آپ کے فخرات عشرہ پر اجمالی نظر یہ ہے:



آپ نے لکھا ہے کہ رسول ایک بشر ہے مثل ہماری مخلوق ہے۔ اور مخلوق اور خالق کی اطاعت میں فرق ہے۔ آپ نے اس میں حیثیت کا فرق نہیں کیا۔ رسول حیثیت بشریت ہماری طرح ایک مخلوق ہے جس کی اطاعت نہ فرض ہے، نہ واجب۔ مگر بوجہ رسالت اور حیثیت نبوت اس کی شان یہ ہے کہ اس کی اطاعت بعینہ خدا کی اطاعت ہے۔ غور سے پڑھیے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ

جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے (آیہ ۱)۔ میری پیش کردہ مثال مذکورہ بہاں بھی صاف آسکتی ہے۔ ہائی کورٹ کا جج حیثیت ایک فردیت ہونے کے کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قبل نقر اس کا فیصلہ کچھ نہیں۔ بعد پبلشن بھی ہیج ہے۔ مگر حیثیت بوجہ حکومت جو کچھ ہے وہ عیاں ہے۔

اب میں تفصیل وار آپ کے فقرات عشرہ پر نظر کرتا ہوں:

فقہہ نمبر ۱:

صحیح ہے، بجز اتنے حصے کے جو رسول کے متعلق میں ابھی

عرض کر چکا ہوں۔

فقہہ نمبر ۲:

جو باتیں رسول کے اپنے اجتہاد سے غلط ہوتی تھیں ان پر تنبیہ الہی



وارد ہو جاتی تھی۔ ملاحظہ ہو:

عَفَى اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذْنَبْتَ رَبَّهُمْ : لِمَ تَحْرِمُهُ  
مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ وَغَيْرُهُ

جن پر تہیہ نہیں ہوتی تھی وہ مسلمہ رہتی تھیں تاکہ حکم فی رسول اللہ  
اسوۃ حسنۃ امت کے لیے اسوۃ حسنہ بن سکیں:

فقہہ نمبر ۳۳:

آپ نے لکھا ہے ”ہمارا دعویٰ ہے کہ وحی کی ضرورتوں کے مطابق  
جتنی وحی درکار تھی قرآن مجید میں جمع کر دی گئی ہے“  
بتشریح بالامیر ابھی اس پر صواب ہے۔

فقہہ نمبر ۴:

بیان رسول جو بقول آپ کے بھی ابدی اور احسن ہے (ملاحظہ ہو اخیر  
فقہہ نمبر ۱۳) اس کی تلاش کے لیے کتنی بھی تکلیف ہو برواشتہ کرنی عین  
حکم الہی کے ماتحت کارِ ثواب ہے۔

الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنًا

پس ہمارا یہی ایمان ہے کہ بتشریح بالقرآن مجید کے ذریعے سے خدا  
نے یہ رحمت پوری کر دی۔

فقہہ نمبر ۵: (اس کے جواب میں)



ہماری پیش کردہ مثال کافی ہے کہ قانون بذاتہ مستقل ہے اور  
ہائی کورٹ اور پریوی کونسل کے فیصلے مستقل بالذات نہیں بلکہ،  
قانون پر متضرع ہیں مگر پابندی میں برابر۔

جنگ بدر ہوا اُحد وغیرہ کا قرآن مجید میں مذکور ہونا اور اس کی تشریح  
کا حدیثوں میں ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔  
فقہ نمبر ۶ :

ہماری پیش کردہ مثال اس کا جواب کافی ہے۔

لطیفہ : قرآن مجید رکنے پر مبغوض ہونا قرآن سے ثابت نہیں، حدیث  
سے استدلال کہ ناگو یا حدیث کو قائل استدلال تسلیم کر لینا ہے  
نافہم :

قرآن کے سوا اور کوئی ذریعہ تھا مگر بحالت عموماً قرآنی احسن کی مثال  
ہم دے چکے ہیں۔

فقہ نمبر ۷ :

جواب ایضاً

فقہ نمبر ۸ :

جیہا کے وقت پر وہ کا حکم نہ تھا نہ قرآنی نہ حدیثی بلکہ ضرورت خاتی  
تھی جس میں جیہا مانع ہو سکتی ہے۔ جب حکم آیا تو جیہا مانع نہ ہوئی۔



## فقہہ نمبر ۹ :

قرآن کی مثل بلاغت اور نظام عبارت (بقول سرسید مرحوم ہدایت بھی سہی) اور اخبار غیبیہ میں تھی۔ حدیثوں میں یہ مجموعہ اوصاف نہیں لہذا تمدنی بھی نہیں۔ آپ کا یہ کہنا کہ ”رسول خدا کے پاس کوئی اور چیز نہ تھی جو اور بشر میں نہ تھی“ قرآن مجید کے صریح خلاف ہے۔ غور سے سنئے!

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ  
يُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

رسول کے حکم سے سرتابی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے۔ اس سے  
کہ ان کو کوئی مصیبت پہنچ جائے یا سخت عذاب سردست۔

## فقہہ نمبر ۱۰ :

راویوں کا سلسلہ متاخر ہے۔ ہماری گفتگو پہلے مرحلے میں سے کہ  
قرآن مجید کے ساتھ اقوال نبویہ کو خواہ ہم ان سے براہ راست منسب کیا  
نسبت ہے۔ اگر وہی نسبت ہے جو ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ اور قرآن مجید  
سے ثبوت دے آئے ہیں تو راویان کلام کی مشکل خود ہی حل ہو جائے  
گی۔

## استفسار :

اور کسی سے گفتگو ہوتی تو نوعیت اور ہوتی۔ مگر چونکہ یہ سلسلہ محض روایت



ہے اس لیے بشکل استفسار عرض ہے کہ آپ بتائیں کہ آپ کا فقرات  
 عشرہ . الگ الگ مستقل دس ویلیں ہیں یا سارے مل کر ایک دلیل  
 ہے اور تعداد ان میں مثل تعدد اجزاء کے ہے ؟ ہاں یہ بھی فرمائیں کہ اس  
 موضوع میں آپ کا دعویٰ کیا ہے . جس پر یہ ایک یا دس ویلیں آپ کے  
 پیش کی ہیں . مہربانی فرما کر حسب قاعدہ اپنے دعویٰ پر سب سے  
 پہلے اطلاع دیں :

منکرین حدیث کے اعتراضات کے جوابات چاہے کتنی وضاحت دیے جائیں گے  
 یہ مقررہ طریقہ ہے کہ وہ اعتراضات کو دہراتے جائیں گے اور آج تک ہمارے ہیں۔

## ۲ اہل قرآن اور حدیث

جناب مولانا!

السلام علیکم : میں نے مولوی حسنت علی اہل قرآن کو حدیث کی بابت  
 لکھا تھا کہ تم لوگ منکر حدیث ہو۔ انہوں نے جو جواب دیا وہ بظرف شاعت  
 ارسال ہے :

والسلام علی من اتبع الهدی آپ کا عنایت نامہ مورخہ ندارد  
 پہنچا . آپ نے رسالہ اشاعت القرآن کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ کئی بار



دیکھنے میں آیا ہے۔ اس میں بجز اس امر کے کہ حدیث نبوی کوئی چیز نہیں بلکہ مفتریات کا بیٹل ہے اور کچھ نہ پایا۔“

جو اباً عرض ہے کہ رسالہ مذکور میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ حدیث نبوی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ حدیث جو پیش کی جاتی ہے نبوی نہیں اور آپ (حضرت) اس سے پاک ہیں۔ آپ (حضرت) کے ذمہ ناحق لگائی گئی ہے جناب من رسول اسلام علیہ کی حدیث کا منکر تو ہمارے نزدیک بھی اسلام سے خارج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جس حدیث پر اعتراض ہے وہ رسول اسلام علیہ نے فرمائی بھی ہے یا ناحق ان کے ذمہ لگا دی گئی ہے اور کوئی ایسی حدیث نبوی ہو بھی سکتی ہے جو قرآنی مضمون کی مخالف ہو۔ مطابق آیہ انہ لقلول رسول کسایم۔ مناسب تو یہ تھا کہ جس حدیث پر اعتراض ہے کہ قرآن شریف اس کی تصدیق نہیں کرتا اور وہ رسول پاک کے ذمہ ناحق لگا دی گئی ہے۔ اس کو قرآن شریف کے مطابق ہونے کے دلائل لکھے جاتے نہ کہ بلا دلیل حدیث نبوی کے منکر ہونے کا جوہم لگایا جاتا ہے۔ نبوی کا لفظ آپ نے اپنی طرف سے ہمارے ذمہ لگا دیا ہے جو بعد از انصاف ہے بلکہ ثبوت اس بات کا ہے کہ اسی طرح وہ خلاف مضمون قرآن احادیث رسول اسلام علیہ کے ذمہ لگا دیے گئے ہیں جس طرح آپ نے حدیث نبوی کا انکار ہمارے



ذمہ لگا دیا ہے۔

(سیکرٹری انجمن اہل قرآن لاہور)

## اہل حدیث

دھوکہ بازی یا اخفا، حق ہر طرح بڑا ہے۔ خصوصاً مذہب میں تو بہت ہی بڑا ہے۔ مولوی عبداللہ چکری الہی بانی فرقہ اہل قرآن میں یہ خوبی تھی کہ وہ صاف صاف اپنا مذہب بتاتے تھے اس لیے انھوں نے اپنی تصنیفات میں صاف صاف لکھا ہے کہ (معاذ اللہ) محدثین سب شیطانیا خیالات ہیں۔ مگر مولوی شمس علی صاحب جو آج کل ان کے خلیفہ ہیں ذوالوجہ بات کہتے ہیں۔ آپ نے اس خط میں حدیث نبوی کے انکار سے انکار کیا ہے۔ ایسا ہی رسالہ ۱۲ میں لکھا ہے کہ:

”میں حلفاً گنتی مرتبہ اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ جو شخص محمد رسول اللہ اور آپ کی حدیث اور اقوال اور آپ کے اصحاب کا مخالف ہے وہ ملحد اور کافر ہے“

کیسی صفائی سے اقرار حدیث ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی لکھا ہے کہ:

”فقیر کی تحقیق میں ان رسول اللہ اور صحابہ کے اقوال اور حدیث



تو صرف قرآن کریم ہی ہے جو ہر طرح مفصل اور مکمل ہے۔" ص ۳  
 پس فیصلہ ہوا کہ آپ جہاں حدیث نبوی کا اقرار کرتے ہیں اس  
 اقرار میں دراصل انکار مخفی ہوتا ہے کیونکہ آپ کی اصطلاح میں حدیث  
 نبوی حدیث قرآن کا نام ہے، گوکہ پیچ اور جملہ اہل اسلام کی اصطلاح میں  
 حدیث نبوی سوائے قرآن مجید کے اس روایت کا نام ہے جو آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم سے بسلسلہ راویان کے پہنچے۔ یہیں معلوم سائل کے  
 سوال (جو عام اہل اسلام کی اصطلاح پر مبنی ہے) اس کا جواب اپنی اصطلاح  
 خاص سے دینا کہاں تک جائز ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بالکل اس  
 مکالمہ کے مشابہ ہے جو ایک عاشق نے اپنے معشوق کو اپنی اصطلاح  
 میں پوری کہہ کر مخاطب کیا تو اس نے عام اصطلاح کے مطابق جواب  
 دیا جو یہ ہے:

میں نے کہا سایہ کہو مجھ پر اسے پوری

بولو کہ اس کے سایہ سے یہ سیر چاہیے

ایمانداری و پابندی کا مقتدا یہ ہے کہ سائل کا مافی ارض میر  
 سمجھ کر صحیح صحیح جواب دیا جائے نہ کہ سوال کو الجھن میں ڈال کر  
 غلط جواب سے خاموش کرنے کی کوشش کی جائے۔ امید ہے سائل  
 اور محیب آئندہ اس اصول سے باخبر رہیں گے، الحدیث ۲، پارچ ۳، سلسلہ



مرویہ اصطلاحوں کو خواہ مخواہ بدل کر نئے معنی پہنانا  
کوئی حق پسندی نہیں

۳

## اصلاح نماز

تو کار زمین رانگو سارستی

کہ پا آسماں نیز پروا نختی

مسلمانوں کے دماغ آج کل عجیب بندی کی طرف جا رہے ہیں  
احکام شرعیہ کی توقیر اور تصدیق تو یہ تھی کہ :

أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا

دل اور زبان سے بے چون و چرا تصدیق اور تعمیل ہوتی۔

آج کل کے زمانہ کو ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے جو حقیقتاً با اصطلاح

صلحا تنزیل کا وقت ہے۔ اس زمانہ میں کثرت سے مسلمان ہیں جو نماز

پڑھتے ہی نہیں مگر فرض جانتے ہیں ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو نماز کو

پیکاری کا شغل جانتا ہے اور خود کو اتنا عدم الفرصت جانتا ہے کہ

بحکم اصول رٹائے از منی، نماز میں وقت لگانا قیمتی چیز (وقت)

۱۹۲۹ء یوم جمعہ المبارک ۱۱ ہجرت



کا بے کار ضائع کرنا ہے۔  
تیسرا گروہ بھی ہے جو نماز کو فرض جانتا ہے مگر پتھلوں کی تنگی اور صفائی  
ان کو نماز سے مانع ہوتے ہیں۔

ان سب گروہوں کے علاوہ امرت سر میں ایک گروہ ایسا بھی  
پیدا ہوا ہے جو مردہ نماز کی تحسین کرتا ہے مگر ٹھوڑی سی اصلاح کا  
خواہشمند ہے۔ چنانچہ اس گروہ کے سرگروہ کے الفاظ یہ ہیں:  
”ہماری مردہ نماز میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ یہ تمام نمازوں  
کا خلاصہ ہے۔ مردہ و عاقل کے علاوہ ہم اس میں اور دعائیں  
بھی مانگ سکتے ہیں اور خدا سے تعالیٰ کو اور بھی زیادہ پاؤ  
کر سکتے ہیں اور اس کی طرف دھیان رکھا سکتے ہیں اور اگر  
اس میں تین اصلاحیں کر دی جائیں تو کسی صلح پسند خدا پرست  
کو ہمارے ساتھ مل کر نماز پڑھنے میں کوئی اعتراض نہیں ہو  
سکے گا۔“

اول: التحيات لله في السلام عليك ايها النبي كبحك  
السلام على النبي كما جائى. یہ اصلاح نہایت ہی  
ضروری ہے! نمازیں کسی مخلوق کے ساتھ بات چیت کرنا صحیح  
نہیں اور پھر اس مخلوق کے ساتھ جو سامنے موجود نہ ہو



بلکہ دوسرے عالم میں پہنچی ہوئی ہو۔

دوم: اگرچہ امتحانات پر صالحین پر سلام کہا گیا ہے۔ لیکن اگر درود شریف میں بھی رسول خدا اور آپ کی آل کے ساتھ دوسرے مذاہب کے صالحین اور مصطفیٰ لوگوں کو ملا لیا جائے تو اس سے ہماری صاف ولی اور رواداری کا ثبوت ملے گا۔ کوئی نقص نہیں پیدا ہو جائے گا۔ میں مانتا ہوں کہ آل ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ میں یہود و نصاریٰ کے تمام نیک بندوں پر درود و برکات کے نازل ہونے کا ضرور ذکر آجاتا ہے۔

سوم: جو لوگ عربی زبان کو نہیں سمجھتے۔ یا الفاظ کو طوطے کی طرح رٹ لینے کے سبب انھیں توجہ الی اللہ نہیں حاصل ہوتی۔ انھیں چاہیے کہ اپنی اپنی زبان میں ذکر الہی کہیں اور دعائیں مانگیں۔

(”بلاغ“ اترتیسری کیم و ستمبر ۱۹۲۸ء ص ۲۰۸-۲۰۹)

## اہل حدیث

یہ اصلاح اگر غیر مسلموں کو تازہ میں شریک کرنے کی غرض سے ہے تو



ہمارے خیال میں چند اصلاحات کی ابھی ضرورت ہے:  
 الف: کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کی ضرورت اٹھادی جائے کیونکہ  
 غیر مسلم اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

ب: التعمات میں ”عبدہ در سونہ“ بھی حذف کیا جائے کیونکہ غیر مسلم اس کو  
 ناپسند کرتے ہیں۔

ج: سورہ فاتحہ میں ایاک نعبد و ایاک نستعین بھی حذف  
 کیا جائے کیونکہ نیک دل بت پرست اور نیک طبیعت عیسیٰ  
 پرست وغیرہ لوگ اس حصر کے قائل نہیں۔

د: نماز میں کوئی آیت ایسی نہ پڑھی جائے جس میں نبوت محمدیہ کا  
 اقرار ہو جیسے اَنَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ يَا الَّذِينَ  
 آمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ

ح: اللہ اکبر بھی نہ کہا جائے کیونکہ لاہوری اہل قرآن صالحین (کمال  
 غلطی سے) اس کو شرک کہتے ہیں۔

و: درود میں آل محمد کا لفظ بھی حذف کیا جائے کیونکہ خارجی لوگ  
 آل محمد کے منکر ہیں یا تاویل کرتے ہیں۔

ز: قرآن کی سورہ اخلاص رقل هو اللہ احد، نماز میں نہ پڑھی  
 جائے کیونکہ تثلیث کے قائل ر صلح جو عیسائی بھائی، اس



کے مخالف ہیں۔

ہماری ان ترمیمات معقولہ کے بعد جتنا حصہ نماز کا رہے گا اس پر مزید غور کرنا ابھی باقی ہے۔

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حدیث سے مرہٹ کر دین کے ارکان کا کیا انجام ہوگا۔ اور منکرین حدیث کے پیش نظر اصلاح سے یا تخریب وین۔

## امر تسری اہل قرآن جماعت میں بہمہوارم

امر تسری اہل قرآن (منکر حدیث) پارٹی کا آرگن رسالہ "بلاغ" ہے جس کا دعویٰ ہے کہ میں صرف قرآن شریف کا مبلغ ہوں۔ قرآن شریف کی تبلیغ کرنا ہر انسان کے لیے سعادت ہے کیونکہ یہ ذکر مبین ہے ہدای للناس بلکہ ہدای للمتقین ہے۔ مگر قرآن مجید کو اپنی رائے کے ماتحت کرنا قرآن کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی

۲۲ فروری ۱۹۲۹ء یوم جمعہ المبارک - حدیث  
بلاغ والے لوگ قرآن شریف کو اپنی عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔



راتے کی تبلیغ اور قرآن کی ترویج ہے۔

یہ مذہب بنگال سے نکلا۔ ہندوؤں میں ایک صاحب راجہ  
برہموازم | رام موہن بنگالی ہوئے جو بہت بڑے قابل تھے۔ انھوں

نے ہر مذہب کی کتابوں کو مطالعہ کیا ان سب مذہب میں سے جو جو  
بات ان کے خیال میں اچھی معلوم ہوئی اُس کو انھوں نے قبول کیا  
بت پرستی کو چھوڑ کر توحید اختیار کی۔ چھوٹ چھات ترک کر دی عبادت  
کا طریق انھوں نے یہ تجویز کیا کہ:

”الہاں خدا کی طرف متوجہ ہو کر خدا کی صفاتِ کاملہ اور اپنی  
صفاتِ ناقصہ کا تصور کر کے خدا سے بھلائی کی دعا مانگے۔  
وغیرہ“

اتنا کرنے کے لیے اُن کے نزدیک کسی مقام کی پاکسی جہت کی  
ضرورت نہیں یہی اُن کی عبادت ہے یہی اُن کی نماز۔ بنگال کے  
بڑے بڑے ہندو لیڈر مثل بابوسی، آرداس وغیرہ ذاتی طور پر سب  
برہموازم

کی نسبت ہماری تحقیق ہے کہ یہ لوگ بھی  
امر نسری اہل قرآن | آہستہ آہستہ برہموازم سے ملتے جا رہے  
ہیں۔ اس کا ثبوت پیش کرنا آج کے اس ندرٹ میں مقصود ہے۔



میں گزرتا ہی اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب متفق  
مسئلہ اولیٰ ہے کہ نماز ایک خاص صورت اور ہیئت کے ساتھ  
قبلہ رخ ہو کر ادا کرنی اسلامی فرض میں سے ایک اہم فرض ہے۔  
جس کے ارکان یہ ہیں :

قیام . رکوع . سجود . توجہ الی القبلہ وغیرہ  
نماز کے شرائط ان ارکان میں کسی مسلم کو اختلاف نہیں شیعہ سنی  
موجد، مقلد وغیرہ سب اس پر متفق ہیں مگر امرتسری اہل قرآن پارٹی  
نے اعلان کر دیا ہے کہ :

”نماز کی اصل حقیقت میں یہ چیزیں داخل نہیں بلکہ نماز  
صرف ذکر اور دعا ہے خواہ ان ارکان کے ساتھ ہو یا ان کے

بغیر ہو“

یہ مضمون انھوں نے اپنے رسالہ بلاغ بابت جنوری ۱۹۲۹ء  
میں حسب عادت ایک طویل عبارت میں ادا کیا ہے جس کا خلاصہ انہی  
کے الفاظ میں یہ ہے ۔

”حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک ہی وقت میں صبح کے  
وقت فرمایا ہے کہ ” فجر کے پڑھنے کو قاعم کر۔ بلاشبہ فجر کا پڑھنا  
دلنشیں ہوتا ہے“ اور ارشاد کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے تسبیح



تخمیر کیا کرے۔ اور فرمایا کہ تو اپنے جی میں یا آہستہ بول کر ذکر الہی کر اور ان لوگوں کی تعریف کی جو صبح کے اوقات میں استغفار کرتے ہیں۔ اس تعریف میں کوئی اور چیز ساتھ نہیں ملانی۔ یہ بھی دکھلایا کہ نیک لوگ صبح کو دعائیں مانگتے ہیں پھر ڈنکے کی چوٹ پکار کر کہہ دیا کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر یا کسی اور نیک نام کے ساتھ ہر طرح اجازت ہے۔ کیونکہ سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں پھر کس نام اور کس تعریف کو اس کے لیے مخصوص بنا لینا چاہیے اور باقیوں کے ترک کا فتویٰ دے دینا چاہیے افسوس افسوس!! " ص ۳۳

اس اقتباس میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ اصل نماز کی حقیقت محض ذکر اور دعا ہے۔ ارکان مخصوصہ اس میں داخل نہیں۔ اس کے بعد پھر لکھا ہے کہ:

"جب قرآن مجید نے پہلے تمام لوگوں کو اقیما الصلوٰۃ فرمایا ہو گا تو اس کے معنی بھی مذکورہ بالا طور پر کرنے ہی لازم و واجب ہوں گے۔"

حاصل یہ ہے کہ قرآن حکیم رسول اور دوسرے لوگوں کو پاتو اپنی سکھائی ہوئی نماز کا حکم دے سکتا ہے یا دوسری کتابوں



کی سکھائی ہوئی یا اپنی بچھ سے نکالی ہوئی نماز کی باہر تہہ ہی کہہ

سکتا ہے کہ اس سے قائم کرو۔" ص ۲۳۴

اس سارے بیان سے نتیجہ بتایا گیا ہے کہ:

"پراوران: قرآن مجید کوئی ایسی مخصوص نماز نہیں کہ نہیں سکھاتا

جس سے دوسروں کی نمازیں مطلقاً نماز نہ سمجھی جائیں۔ اور

خدا پرست لوگ موقع پر طے پر خدا کی یاد میں اسے نہ پڑھیں

اگر قرآن مجید میں کوئی ایسی مخصوص نماز (مروجہ) ہوتی تو تمام اہل

عرب کو تو نہ سہی اہل قرآن ہونے کے مدعیوں کو تو مشترکہ

طہور پر نذر آجاتی۔ اندر میں صورتاً جو لوگ قرآن کہیم سے ایسی

مخصوص نمازوں کے نکالنے کی کوشش کریں گے بالضرور

نئے نئے فرقوں میں تقسیم ہوتے جائیں گے" ص ۲۳۵

پس اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ اس جماعت کے نزدیک

نماز کی اصل حقیقت صرف اتنی ہے جو برہوں کے نزدیک ہے۔ ہاں

مروجہ نماز کو بھی یہ لوگ نماز کہتے ہیں اس لیے کہ اس میں ذکر الہی ہے۔ مگر

ارکان کو داخل ماہیت نہیں جانتے چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ

ہیں:

"اہم اس مروجہ نماز کو بہت عمدہ اور معقول سمجھتے ہیں اور"



بخوشی ادا کرتے ہیں لیکن دوسروں کی موعدانہ اور معقول نمازوں  
کی بھی بے قدری نہیں کرتے اور کسی ورو مند دل کچھ کر کو  
حقیر نہیں جانتے " ص ۲۳۱

## اہل حدیث

پس اصل حقیقت نماز ان کے نزدیک وہی ہوئی جو یہودیوں کے  
نزدیک ہے یعنی صرف ذکر اور دعا۔

ہم اس مضمون کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں جانتے کیونکہ یہ  
ایک ایسا مضمون ہے جو مسلمانوں کی فوجی اور مذہبی تو اثرات کے  
خلاف بلکہ قرآن مجید کی نصوص قطعیہ کے صریح مخالف ہے کیونکہ

قرآن مجید میں ارکان صلوٰۃ کے لیے صاف صاف ارشاد ہے:

قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ . اِرْكَعُوا وَاَسْجُدُوا وَاَعْبُدُوا  
مَّا يَكْتُمُونَ وَاَفْعَلُوا الْخَيْرَ . لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

ان آیات میں قیام - رکوع اور سجدہ کا صاف لفظوں میں حکم  
ہے۔ اس سے پرہیز کر لیا چاہیے۔ مگر نہ ماننے والوں کے لیے تو  
کوئی حکم کیا ہی صاف سے صاف لفظوں میں ہو سکتا نہیں ہو سکتا

چنانچہ:



مسئلہ قبلہ | قابل ہے کیونکہ یہ جماعت کعبہ کی طرف منہ کرنا ضروری کی بابت اس جماعت کی رائے خاص کر سننے کے

نہیں جانتی۔ اس لیے رسالہ ”بلاغ“ بابت فروری ۱۹۲۹ء میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی۔ قرآن مجید میں صاف لفظوں میں ارشاد

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَوَلُّوا  
وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ

قابل مضمون نگار مولوی احمد الدین صاحب جو اس جماعت کے سرگروہ ہیں اور آج کل قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے ہیں، اس تفسیر میں فرماتے ہیں۔

”شطر کے معنی ہیں جہت کے اور ان آیات میں جہت و قبلہ و وجہ صلوٰۃ کے ہی ہیں چونکہ مسجد الحرام میں نماز ہر طرف پڑھی جاتی ہے۔ اس لیے مسجد الحرام کی جہت صلوٰۃ ہر طرف ہے اور مسجد الحرام کی جہت صلوٰۃ کی طرف منہ کرنے کے معنی ہر طرف منہ کرنے کے ہیں۔ یہ مسجد ہدیٰ للعالمین ہے اور ہر جہتی قبلہ کا سبق دیتی ہے۔ یہ مسجد سفر و حضر میں ہر جگہ خود ہی قبلہ نہیں بن سکتی جیسا



کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس لیے ہر جگہ اس کی جہت  
صلوٰۃ کی طرف ہی منہ کرنا چاہیے جیسا کہ آگے ارشاد  
ہوتا ہے:

قَوْلٍ وَجْهِكَ شَطْرًا اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

کے ایسے معنی لینے غلط ہیں جن سے ایک مخصوص قبلہ  
کی خصوصیت کو مٹا کر دوسرے مخصوص قبلہ کی خصوصیت  
کو قائم کیا جائے۔

## اہل حدیث

”مطلب در بطن قائل“ کی مثال دیکھنی ہو تو یہ ہے۔ ہاں جو کچھ ہم نے  
اس عبارت کا مطلب سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ:  
”جس طرح کعبہ کے چو طرف نماز پڑھتے ہیں اسی طرح یہاں  
(ہندوستان میں) بھی ہم ہر طرف مشرق، مغرب، اتر  
و کن کو رخ کر کے پڑھ سکتے ہیں کیونکہ یہ قول آپ کے  
مسجد الحرام کی جہت صلوٰۃ ہر طرف ہے“  
کیا کوئی ذرہ بھر بھی عربی علم سے واقف اس تشریح کو نفی کر سکتا ہے یا  
تخریب کہنے پر مجبور ہے۔



اسے چنانچہ "مسجد الحرام کی چہرہ صلاۃ پر طرف ہے" اس  
کا مطلب یہ ہے کہ مسجد الحرام کی چاروں طرف گھر سے ہو کر اس  
کی جانب منہ کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں نہ یہ کہ اس کی طرف پیٹھ  
کر کے۔ مشرب یا مشرق کو رخ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ ہم بغرض  
تقسیم ذیل میں مسجد الحرام کا نقشہ دیتے ہیں



چار نمازی ہیں۔

ان میں سے ایک الف کی جگہ اور اب کی ایسرا ج  
کی چوکھٹا کی جگہ گھرا ہو کر مسجد الحرام کی طرف منہ کر کے نماز  
پڑھ سکتا ہے۔ یہی اس کی شرط (جانب) ہیں۔ یہ نہیں کہ مسجد الحرام  
کی دیواروں کے ساتھ پیٹھ لگا کر مشرق، مغرب کو منہ کر کے نماز پڑھے  
تو جائز ہے۔

ہاں یہ بھی آپ نے خوب کہا اور ہم نہیں سمجھتے کہ آپ کو کہاں تک  
یہ مفید ہے جو فرماتے ہیں کہ:

«قول وجهك شطر المسجد الحرام کے ٹیکہ معنی



یہ ہیں کہ تو اپنے منہ کو مسجد الحرام کی طرف نہیں بلکہ مسجد الحرام

کے شطر کی طرف پھیر " ص ۲۲۶

پس اب مطلع صاف ہے شطر کے معنی جہت کے

بہت خوبصورت آپ کو تسلیم ہیں۔ ملاحظہ ہو عبارت منقولہ از

ص ۲۲۶ - ۴

اب ہم پوچھتے ہیں کہ ہندوستان خاص کر صوبہ پنجاب میں علیحدگی  
ہوئے شطر کہیں کہ مسجد الحرام کی طرف ہے؟ جواب ملتا ہے کہ گرمی  
سر دی کے مغربین کے درمیان پس اس صورت میں مسجد الحرام  
کی جہت یا شطر مغربی طرف ہوتی جس کا نقشہ یہ ہے۔

مسجد الحرام

(مشرق) پنجاب (مغرب)

اب اہل پنجاب کو حکم ہوتا ہے کہ نماز میں مسجد الحرام کی جانب منہ  
پھیرو تو وہ اس حکم کی کس طرح تعمیل کریں شطر مسجد الحرام تو ان کو  
مغربی جانب ملی۔ مگر جانب کی جانب کے اور کیا معنی ہوں گے۔  
یہ ہے کہ "ولی یوئی" میں جو دراصل مفعول اول  
اصل قانون ہوتا ہے اس کو دوسرے کی طرف پھرنے کا حکم  
ہوتا ہے (عربی زبان کے قواعد کی رو سے.....) اس



قاعدے کے ماتحت ہم دو الفاظ قرآنی پیش کرتے ہیں جو ایک کے معنی ہیں وہی دوسرے کے۔ غور سے سنیے!

اول: من یولہم یومئذ دبرہ

دوم: فولوا وجہکم شطرہ

پہلی مثال میں مفعول اول ورائل و بر ہے "ہم" ضمیر متصل ہونے کی وجہ سے پہلے آیا ہے، معنی اس کے یہ ہیں:

"جو کوئی اپنی دبر کافروں کی طرف پھیرے"

(اس پر غضب ہے)

اسی طرح دوسری مثال کے معنی ہیں۔

"اپنے مونہوں کو مسجد الحرام کی جہت کو پھیرو"

یعنی تمہارے ملک سے جس طرف کعبہ ہے اسی طرف کو رخ کر لو پس یہی مدعا ہے۔ معلوم نہیں ایسا صاف اور صریح حکم ہونے سے ہونے بھی ایچ پیج کہ نابہ ہوازم کی تائید نہیں تو کیا ہے۔

کہ اس جماعت قرآنیہ کے نزدیک نماز کی اصل حقیقت مختصر یہ ہے

انتی ہے کہ انسان کسی جگہ بھی یکسو ہو کر یہ کہے کہ:

اے اللہ تو پاک ہے۔ تو مالک الملک ہے میں عاجز بندہ

ہوں، تو میرے حال پر رحم فرما اور میری حاجت پوری کر دینے



بس نماز ہو گئی۔ اکیلا کہے تو نماز منفر ہوگی چند اشخاص مل کر کہیں تو  
 باجماعت ہوگی۔

یہی معنی ہیں :

کوے جاناں سے خاک نہیں گے

اپنا کعبہ نیا بنائیں گے

ملتِ اسلامیہ کی یکجہتی اور شطر مسجد الحرام میں جو تعلق ہے اُس کو جاننے  
 والے منکرین کے ان ارشادات کا منشا سمجھ سکتے ہیں۔

۵

## اہل قرآن اور اقران

”ناظرین! آج ہم بہت مدت بعد اہل قرآن کی طرف متوجہ  
 ہوتے ہیں۔ اتنی مدت میں شاید آپ بھول گئے ہوں کہ  
 اہل قرآن کون ہیں؟ کیونکہ اہل قرآن ایک ایسا لقب ہے  
 کہ ہر مسلمان اہل قرآن ہونا چاہئے۔ لیکن ان اہل قرآن  
 اور عام اہل قرآن میں وہی فرق ہے جو اہل منطق کے  
 نزدیک تصور یعنی علم اور تصور سافرج میں فرق ہے۔“

۲۲ دسمبر ۱۹۲۶ء یوم جمعہ المبارک اہلحدیث



پہلا عام ہے جو تصدیق کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے بلکہ تصدیق کو شامل ہے۔ دوسرا تصدیق کا قسم ہے یہی معنی ہیں اہل قرآن کے۔ عام معنی تو اس کے یہ ہیں کہ قرآن مجید کو کلام الہی ماننے والی قوم۔ اتنا مفہوم سب مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ مگر دوسرے معنی اہل قرآن کے یہ ہیں کہ فقط قرآن کا قائل گروہ یعنی حدیث نبوی کی منکر جماعت، آج ہمارے مخاطب یہی لوگ ہیں۔

اہل قرآن چونکہ مدتی ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن مجید میں مذکور ہے حدیث کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن مجید مبین اور مفصل ہے اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن مجید سے نکالیں۔ چونکہ یہ کام اجتناب اور استنباطی نوت سے کرتے ہیں اس لیے بسا اوقات ان میں آپس میں اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز کے مسائل میں جو کچھ ان کا باہمی اختلاف ہے وہ اس وقت ہم نظر انداز کرتے ہیں اور صرف اذان کے مسئلہ پر آج توجہ کرتے ہیں۔ اہل قرآن پارٹی میں مسئلہ اذان کے متعلق ہم کو دو بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ناہوری گروہ کا جن کے سرگروہ آج کل مولوی خورشید



صاحب ہیں جو کسی زمانہ میں یہاں قیام رکھتے تھے۔ دوسرا گروہ :  
 گوجرانوالہ ہے جس کے سرگروہ آج کل مولوی نحر رمضان ہیں۔ پہلے  
 گروہ کا اذان کے متعلق یہ مذہب ہے کہ آدمی اذان بیشک دس کے  
 مگر کلمات اُس کے الفاظ قرآنی ہوں چنانچہ مختلف سورتوں سے  
 مختلف کلمات اُنھوں نے ایسے نکال رکھے ہیں جن میں نماز پڑھنے  
 اور ذکر کی طرف آنے کا ذکر ہے۔ وہ ان سب کلمات کو مسجد کی  
 چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے پڑھا کرتے ہیں مگر خدا کی قدرت کہ  
 ان میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں یہ ذکر ہو کہ سننے والو مسجد میں  
 آکر باجماعت نماز پڑھو۔

ہم نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ خدا کی حکمت سے جو بلند آواز اور موزوں  
 اذان میں ہے وہ ان کلمات میں نہیں۔ اس کے بعد مولوی حشر  
 علی صاحب لاہوری دفتر اہل حدیث میں آئے اس وقت مولوی  
 عبدالقواب صاحب عزیزی بھی بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے اُنھوں  
 نے اذان کی سب آیتیں بلند آواز سے پڑھیں اور مجھے کہا کیا  
 ان میں سر نہیں ہیں؟ میں نے کہا تم خود ہی سوچ لو۔ کہاں یہ آواز  
 صحیح علی السلوٰۃ صحیح علی الفلاح

اور کہاں یہ آواز



أَقِمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ

اس کی بلند ہی اتنی نہیں ہو سکتی جتنی اذان میں ہوتی ہے۔ خیراً  
دوسرے گروہ نے اس ساز سے جھگڑے کا خاتمہ ہی کر دیا  
وہ کہتے ہیں کہاں کی اذان اور کہاں کے کلمات۔ یہاں یہ تو کسی انسان  
کی آواز نہیں بلکہ آسمانی آواز ہے جس پر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ آج  
ہم اس گروہ کے ماہوار رسالہ سے پوری عبارت دکھاتے ہیں جو  
بہت لطیف ہے۔ ہم نے اس کو بہت لطیف پایا۔ ہم چاہتے ہیں  
کہ ہمارے ناظرین بھی لطف اٹھائیں۔

کسی صاحب نے اُن پر سوال کیا تھا کہ قرآن مجید میں ارشاد  
ہے ”إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ“ اس سے معلوم  
ہوتا ہے کہ نماز کے لیے ندا ہوتی تھی اس کے جواب میں جو کہا گیا وہ  
درج ذیل ہے:

”موضوع ہے کہ قرآن کریم کے اس مقام میں ندا سے کوئی  
انسانی ندا پر گزرا نہ ہو۔ بلکہ ندا آسمانی مراد ہے جو  
ہر جگہ سنائی دیکھا جاتی ہے۔ انسانی ندا تو ایک گاؤں یا  
ایک قصبہ کے احاطہ میں دیکھا نہیں پہنچ سکتی جس  
سے انسان مکلف حکم ربانی ہو سکے جو پتھر بہ اور مشاہدہ



سے بھی ثابت ہے جب کہ انسان نے اس انسانی ندا کو  
 سنا ہی نہیں تو وہ صلوٰۃ میں کیوں آئے اور اس حکم کو کس طرح  
 ادا کرے جو ان الصَّلٰوةَ کَانَ عَلٰی الْمَوْمِنِیْنَ کِتَابًا  
 مَوْقُوْتًا پ. ۱۲۶، ہے پس اس جگہ نو دہی سے مراد  
 وہ ندا ربانی آسمانی ندا ہی ہے جو ہر جگہ ہر فرد بشر کو ہوشیار  
 خبردار کر دیتی ہے جس سے ایک فرد بھی باہر نہیں ہو سکتا۔  
 اور نہ ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے یہ ندا سنی ہی نہیں اور  
 اس ندا ربانی سے ہر فرد بشر مومن صلوٰۃ کا تکلف ہو جاتا،  
 اور جو محیط النکل کا حکم رکھتی ہے۔ اب ایک اور دلیل سے  
 بھی اس جگہ انسانی ندا نہیں ہو سکتی وہ یہ ہے چونکہ حکم ہر  
 ایک مومن کے لیے یہ ہوا ہے کہ ندا سن کر صلوٰۃ کے لیے  
 آؤ اور کام کاج چھوڑ دو۔ قبل آواز سننے کے ایک مومن بھی  
 نہیں آسکتا معقول پسند اصحاب کو یہ بات تشویش میں  
 ضرور کر دے گی کہ وہ شخص جو دوسرے مومنین کو بلاتا ہے  
 وہ ان مومنین میں سے کوئی الگ ہے کیونکہ آیہ مجیدہ نے  
 مومنین میں سے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا اور نہ ہی کسی ایک  
 کے لیے تخصیص واقع ہوئی ہے جیسا کہ اِذَا ضَرَبْتُمْ رِیْقًا



الْأَرْضِ ..... الخ یعنی قصر صلوٰۃ میں پڑھانے والے  
 ایک کو خاص کیا گیا ہے جو اِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ  
 الصَّلَاةَ کے حکم سے ہیں۔ کہ صلوٰۃ پڑھا تو اللہ پوری  
 نماز یعنی دو رکعتیں پڑھے اور عام مومنین قصر نماز یعنی ایک  
 ہی رکعت پڑھیں پس لفظ نودی میں کوئی خاص شخص ندا  
 کرنے والا مخصوص نہیں کیا گیا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے کوئی  
 پکارنے والے کلمات مقرر کیے ہیں جو وہ خاص ایک آدمی  
 مومن اُس وقت اُن کلمات سے دوسرے مومنین کو پکارے  
 پس وہ منادی ہیں نے اُس ایک مرد کو دوسرے مومنین  
 کو بلانے کے لیے منادی سے کیا وہی منادی دوسروں کے  
 لیے کافی نہیں ہے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ وہ ایک فرد  
 کو ندا کر سکے اور باقیوں کو نہ کر سکے۔ حالانکہ وہ ایک فرد  
 بھی بغیر ندا کیے تو اسی نہیں سکتا۔ اگر وہ بغیر ندا کے آسکتا  
 ہے تو یہ حکم يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ  
 ..... الخ والابے سو وہ جو جائے گا اور وہ شخص اس  
 حکم خداوندی کا خود بے فرمان ہوگا کیونکہ اِذَا نُودِيَ کا  
 ارشاد ہے یعنی جس وقت بلائے جاؤ تم جب اُس کو بلایا



ہی نہیں کیا تو وہ آ کیسے سکتا ہے پس ثابت و بین ہوا کہ  
ندار بانی آسمانی نشان کے اوقات معینہ ہی ہیں جو محیط الکل  
کا حکم رکھتے ہیں پس انسانی ندر محیط الکل ہرگز نہیں ہو سکتی  
لہذا افان مردہ کو بین اسلام میں کوئی دخل نہیں اور نہ قرآن  
کریم میں اس کے حکم کی چنداں ضرورت تھی۔  
بلوغ القرآن بابت اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۲۴ء ص ۲۳  
۲۴

## اہل حدیث

اس سارے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ نودی میں منادی دندا  
کرنے والا کوئی انسان نہیں بلکہ اوقات منادی ہیں جن سے انسان  
خود بخود اوقات پہچان لیتا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اہل قرآن کہلا کر  
قرآن مجید سے اتنے بے خبر جتنا کوئی سبزی خور گوشت کے بھاؤ  
سے ناواقف ہو۔

اے جناب! سنئے ہم آیات قرآنی آپ کے سامنے رکھ دیتے  
ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر بتاؤ یہاں منادی  
کون ہے۔ ارشاد ہے:

إِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هَاهُنَا



”جب تم مسلمان نماز کی طرف جانتے ہو تو کافر منحول کرتے ہیں“  
 اس کا ترجمہ کرتے ہوئے اتنا بتا دیجیے گا کہ فادیتم ہیں جو ضمیر  
 ”انتم“ ہے اس سے کون مراد ہے مسلمان مؤمن یا آسمان نہیں؟  
 ناظرین! ایسا صریح حکم جس کا فاعل مخاطب مسلمان کو بتایا  
 گیا ہے اُس سے بھی انکار کیا جائے تو یہ کہنا بے جا ہوگا؟  
 مگر تو قرآن میں نہ خط خوانی  
 ببری رونق مسلمان!؛

ہاں صاحب آپ کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے جو  
 آپ نے افان وینے والے کو معین شخص ماننے پر کیا ہے؛  
 سنیے قرآن مجید میں اس کی مثل اور بھی ہے ارشاد ہے؛  
 وَارْكَعُوا صَعْمًا لِّلرَّاکِعِیْنَ

رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو

بتائیے اس آیت میں ارکعوا کا حکم سب مسلمانوں کو ہے تو جن  
 راکعین کے ساتھ رکوع کرنا ہے ان کو یہ حکم کیسے ہو سکتا  
 ہے؟ جلدی نہ کرنا سوچ سمجھ کر جواب دینا اور یہ سمجھ کر دینا کہ سلامت  
 کون ہے۔ سنبھل کے رکھو قدم وشتت خار ہیں جنوں  
 کہ اس نواح میں سودا بر مہندہ پا کھا ہے



نہرا کو اوقات سے متعلق کرنے کے واسطے کے باوجود نئی اذان  
ایجاد کرنے کی خواہش ملاحظہ ہو۔

## اہل قرآن کی اذان

ہمارے ناظرین جانتے ہوں گے کہ حدیث کے منکروں کا ایک  
گروہ ہے جنہوں نے اپنا نام "اہل قرآن" رکھا ہوا ہے۔ اس اہل قرآن  
کا جواب کئی دفعہ اہل حدیث میں دیا گیا۔ مگر چند روز سے بوجہ سفر یادگیر  
مشائخ کے ادھر توجہ نہ ہو سکی۔ آج ان کا رسالہ نمبر ۱۳۱ جلد ۲ دیکھنے  
سے معلوم ہوا کہ یہ فرقہ بہت بڑی ترقی کر گیا ہے۔ یہ ترقی اس کو ہمارے  
دوست مولوی حشمت علی (سہ روزی) کی معرفت حاصل ہوئی ہے۔

۱۷ اہل حدیث ۸۰ رجب ۱۹۲۳ء یوم جمعہ المبارک

۲ آپ کا خیال بلکہ اعتقاد ہے کہ رمضان شریف میں کل تین روزے  
فرض ہیں اس لیے آپ کو تیز کے لیے سہ روزی لکھا گیا۔ جیسے ہمارے  
مہربان عنشی قاسم علی خاں بانی مدرسہ اودھانہ کو ہم سہ صدی  
لکھا کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے بھی اودھیا نہ میں تین صدیوں پر علامت شکست  
میں ہم کو عنایت فرمایا تھا۔



ناظرین کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس فرقہ کا ہم (الحمد للہ) سے صرف دو مسئلوں میں اصولی اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حصول علم الہی کا ذریعہ قرآن مجید ہی ٹھہرایا کچھ اور بھی۔

ہم اور کے مدعی ہیں لہذا ثبوت ہمارے ذمہ ہے جس کے دینے کو ہم ہر وقت تیار ہیں اور ہمارے اس کے مباحثہ میں دے کر بقصد منصفانہ سے ایک دفعہ ہم ڈگری لے چکے ہیں۔ پھر بھی اسی طرح یہ تقریر ثالث باصنا بطہ گفتگو کرنے پر آمادہ ہیں۔

دوسرا اصولی اختلاف ہم دونوں میں یہ ہے کہ کسی قرآنی حکم کے لیے قرآنی الفاظ کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ اس حکم کی تعمیل کے لیے بھی قرآنی الفاظ کی ضرورت جانتے ہیں اور ہم اس حکم کی تعمیل کے لیے تعمیلی الفاظ کی تلاش قرآن ہی پر موقوف نہیں جانتے بلکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فعلیہ قولیہ یا محاورہ عرب سے بھی تلاش کرتے ہیں۔ اگر مل جائے تو کافی جانتے ہیں، مثلاً

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

كَبْرَةٌ تَكْبِيرًا

”خدا کی تکبیر بڑھا کر“

اس حکم کے تعمیلی الفاظ قرآن مجید میں مل گئے مگر تعمیلی الفاظ



نہیں ملتے کہ تکبیر کس طرح پڑھا کریں جن سے اس حکم کی تعمیل  
 ہو سکے۔ اس لیے ہم سنت نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحبہ  
 کو دیکھتے ہیں تو ہم کو یہ ملتا ہے کہ حضور (فداہ ارواحنا) اس کی  
 تعمیل میں کہا کرتے تھے:

اللہ اکبر

اور عرب کا محاورہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب کوئی کسی کو کہتا ہے  
 (کِبْرٌ يَا أَخِي) ، اسے بھائی تکبیر پڑھو تو وہ اس کی تعمیل میں  
 کہتا ہے:

اللہ اکبر

دوسری مثال سنئے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے  
 صَلُّوا عَلَيَّ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا  
 تم مسلمانوں! نبی پر صلوٰۃ و سلام بھیجا کرو  
 اب اس صَلُّوا اور سَلِّمُوا کے حکم کے الفاظ تو قرآن مجید  
 میں ملے مگر انکی تعمیل کے الفاظ نہیں ملتے جن سے معلوم ہو سکے  
 کہ کس طرح ہم ان احکام کی تعمیل کریں۔ سنت اور محاورہ عرب  
 سے ہم کو ثبوت ملتا ہے کہ اس کی تعمیل یوں ہے:  
 اللهم صل علی محمد و سلم



برخلاف اس کے اہل قرآن ان احکام کے تعمیلی الفاظ بھی ،  
قرآن مجید ہی سے تلاش کرتے ہیں اور حسب استعداد خود نکالا  
بھی کرتے ہیں۔ جن کی آج مثال بتانے کو یہ مضمون لکھا گیا ہے  
قرآن شریف میں ذکر ہے :

إِذَا نَادَىٰ تَمْرًا إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوا هُنَّ وَا  
”جب تم مسلمان نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو کفار اس کا غمخیز  
ہیں“

اس آیت میں چونکہ مسلمانوں کے اذان دینے کا ذکر آیا ہے ،  
اس لیے اہل قرآن پر سوال ہوتا رہا کہ اذان کے الفاظ قرآن مجید سے  
و کھائے۔ مولوی عبداللہ چمکڑ الوی امام فرقہ اہل قرآن کو تو یہ الفاظ نہ ملے  
وہ تو یہی کہتے رہے کہ اذان سے مراد یہ ہے کہ تم جو لوگوں کو کہتے ہو  
کہ نماز کو چلو وغیرہ۔ مگر ہمارے سہ روزی دوست مولوی حسنت علی  
قائم مقام امام مذکور کو الفاظ اذان مل گئے چنانچہ انھوں نے اپنے  
رسالہ نمبر مذکور میں اذان کے الفاظ لکھے ہیں ہم مولوی صاحب کی  
محنت کی داد دیتے ہیں اور ناظرین سے بھی سفارش کرتے ہیں کہ وہ  
بھی داد دیں اور اگر ان کو مولوی صاحب کی محنت اور جان کا ہی پر  
ہنسی آئے تو ہماری سفارش سے چند منٹ کے لیے ضبط فرمائیں۔



بہر حال وہ الفاظ یہ ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں:

”اذان کے کلمات جو آپ (حضرتؑ) اور آپ کے صحابہ کی زبان سے پانچوں وقت بغیر شک و شبہ کے نکلتے تھے وہ یہ ہیں۔ وہ اذان کے وقت اول یہ کہتے ہیں

۱۔ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَرَسَاتِ الشَّيْطَانِ وَاَعُوذُ  
بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُونِ

(پ ۱۸: ۶)

یعنی اے میرے پروردگار! میں شیطان کی چھیڑ چھاڑ اور اس کے وسوسوں سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں اور ان کے حاضر ہونے سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں۔ یہ تمہیل آیت فاستعذنا باللہ کی ہے۔

جس میں پناہ مانگنے کا حکم تھا۔

۳۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَعْبُدُوا  
رَبَّكُمْ وَأَعْلُوا الْخَيْرَ لَكُمْ تَفْلِحُونَ

(پ ۱۶: ۱۱۷)

اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کیا کرو اپنے پروردگار کے سامنے قولاً اور عملاً اپنی شقائی اور مریدق کو کمال سچائی سے اظہار کیا کرو اور نبی نور انسان عموماً



اور اسلامی بھائی خصوصاً کی خیر خواہی کے کام کرنا کہ

تم واپس میں کامیاب اور پامرا ہو۔

۳۔ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ

خَاشِعُونَ (پ ۱۸ : ۱۱)

۴۔ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ

أُولَئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ (پ ۲۹ : ۱۷)

تحقیق کامیاب وہی لوگ ہیں جو اپنی نمازوں میں

عاجزی کرتے ہیں۔

اور جو لوگ اپنی نمازوں کی متوسط طریق سے حفاظت

کرتے ہیں۔ وہ جنت میں بہت بڑی عزت سے

بیٹھیں گے۔

۵۔ وَالَّذِينَ يَسْكُونُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ

إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (پ ۹ : ۱۱)

جو لوگ جہل اللہ قرآن کریم سے تمسک کرتے ہیں

یعنی کتاب اللہ کی تعلیم کی ہوئی نماز پڑھتے ہیں، ہم

ایسے نیک لوگوں کی محنت کبھی ضائع نہیں کریں گے۔



۷۔ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا

لِلَّهِ قَانِتِينَ (پ ۲: ۱۱۵)

مسلمانو! محافظت کرو تمام نمازوں پر یعنی ہر ایک نماز  
وسطی حالت میں محفوظ رکھو۔ ان کا قیام، رکوع، سجود  
قومہ، جلسہ، قعدہ اذکار نماز اوسط حالت میں ادا کیا  
کرو اسی کا نام حفاظت ہے۔

۸۔ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ  
عِبَادَتِيْ وَيَسْجُدُوْنَ رُكُوْعًا سَاجِدًا (پ ۹: ۱۱۴)

بیشک جو لوگ تیرے پروردگار کے مقرب ہیں، وہ  
اللہ تعالیٰ کی عبادت سے کبھی تکبر اور بغاوت نہیں  
کرتے اور اُس کی تسبیح اور تقدیس اور تحمید نمازوں  
میں بیان کرتے ہیں اور صرف اسی کے آگے سر بسجود  
ہوتے ہیں۔

۸۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ

جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (پ ۲۴: ۱۱)

بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت (نماز وغیرہ) سے  
تکبر اور بغاوت کرتے ہیں وہ عظیم الشان دولت



واذین میں داخل ہونے والے ہیں۔  
 ۹۔ وَاقِمُْوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ

(پ ۲۱: ۷۷)

قرآنی نماز پڑھا کر وادرا نماز چھوڑ کر مشرک نہ ہو۔  
 ۱۰۔ اِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ  
 وَلِذِكْرِ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ

(پ ۲۱: ۱۰۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنی نماز سے حیاتی اور  
 بد چینی کے کاموں سے روک دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ  
 کی حضوری اور اطمینان قرآنی نماز سے پیدا ہوتا  
 ہے۔ وہ بڑا اعلیٰ شان جلیل القدر درجہ رکھتا ہے  
 اور اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے جو کچھ تم لوگ اس کی  
 اطاعت یا بغاوت میں کام کرتے ہو۔

۱۱۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ  
 وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ  
 الْعَالَمِينَ

(پ ۲۳: ۹)

تمہارا رب العزت ہر ایک عیب اور نقصان سے



ہر طرح منترہ اور پاک ہے۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں کامل  
 اور اکمل ہے۔ تم اسی کی تقاریریں اور تمجید نمازوں میں کیا  
 کرو اور ہر ایک مرسل میں اللہ پر داپن میں رحمت اور برکت  
 ہے اور ہر قسم کی خالص تعریف اللہ تعالیٰ رب العالمین  
 کے واسطے ہی مختص ہے جو ہر ایک مخلوق کی ربوبیت  
 جسمانی اور روحانی بغیر کسی درخواست اور معاوضہ کے کرتا  
 رہتا ہے اسی کو سجدہ کرنے کے لیے حاضر ہو کر اس کا  
 تقرب حاصل کرو۔

## اہل حدیث

ماشاء اللہ چشم بد دور۔ تو آپ کی دلیل کا صغریٰ کبریٰ یوں

ہوا:

۱۔ یہ آیات قرآن کی ہیں۔

۲۔ جو آیات قرآنی ہیں وہ اذان ہیں

نتیجہ: یہ نکلا کہ سارا قرآن اذان ہے۔

لہذا ایک نماز قرآنی اذان میں اگر آیات مذکورہ پڑھ سکتا ہے

تو دوسرا آیتیں پڑھ سکتا ہے، مثلاً



تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ

تیسرا یہ پڑھ سکتا ہے  
اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ

چوتھا یہ پڑھ سکتا ہے۔  
اِنسُوا الْحِجْرَ وَالْعَصْرَةَ لِلَّهِ

پانچواں یہ پڑھ سکتا ہے۔  
وَيْلٌ لِلْمُشْرِكِينَ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ  
عَرْضُ جَنَّةٍ مِنْهُ أُتِي بَاتِينَ

لطیفہ:

اہل قرآن کو گو پیدا ہوئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے ہیں مگر  
اسی آزادی کی بدولت انھیں بقول (دس قنوجی گیارہ چولھے)  
دنوں سے زیادہ فرقے بن گئے ہیں جن میں معمولی اختلاف نہیں بلکہ  
اصولی مخالفت ہے۔

۱۔ ایک فرقہ کہتا ہے اوراد نماز قرآن ہی سے مخصوص ہے دوسرا  
اُس کے خلاف ہے۔

۲۔ ایک فرقہ کہتا ہے نماز دو رکعتیں ہیں۔ دوسرا ایک پر ہی کفایت  
کرتا ہے۔



۳۔ ایک فرقہ کتنا ہے نماز میں رکوع ایک ہے سجدے دو ہیں۔  
دوسرا کتنا ہے جس طرح رکوع کا حکم ہے سجدے کا بھی ہے  
لہذا دونوں کا عدد ایک ہی ہے۔

۴۔ ایک فرقہ کتنا ہے روزے پورا مہینہ ہیں۔ دوسرا کتنا ہے تین  
روزے ہیں۔ اب تو ہمارے دوست مولوی حشمت علی صاحب  
کی طفیلیں ان فرقوں کا شمار اور بھی ترقی پر ہے۔

نوٹ:

فرقوں سے مراد کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہزاروں، لاکھوں آدمی ہوں  
گئے۔ نہیں کسی میں ایک ایک طرف ہے تو وہ بھی فرقہ ہے۔ دو  
ایک طرف ہیں تو وہ بھی فرقہ ہے۔

کہ آپس کی یہ حالت ہوتے ہوئے بھی جناب مولوی  
تعجب ہے | صاحب سہ روزی مسلمانوں کے اختلاف کو ان

سب کی تکذیب پر دلیل لاتے ہیں چنانچہ آپ لکھتے ہیں:  
”اسلامی فرقوں کا اختلاف جو اذان کے الفاظ اور ترتیب  
میں ہے اس سے عمام ظاہر ہے کہ اسلامی فرقے ایک  
دوسرے فرقے کی اذان کے الفاظ اور ترتیب کو رسول  
اللہ سلام علیہ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور ترتیب



دی ہوئی آپ کی کو تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ ہر ایک  
فرقہ اپنے یقین سے یہی کہتا ہے کہ یہ اذان کے الفاظ  
اور ترتیب رسول اللہ کی نہیں ہے۔ ان کی اذان محض  
من گھڑت اور خانہ سازانے اپنے اعتقاد سے بنائی  
ہوتی ہے۔

حالانکہ اسلامی فرقوں میں اذان میں کوئی اختلاف نہیں، آپ  
کا قول بالکل غلط اور ناواقفی پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے آپ  
نے شیعوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں :

اشهد ان عیادتی اللہ

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کلیہ کی بابت معتبر کتب شیعہ  
میں لکھا ہے کہ یہ بدعت ملعون لوگوں کی ایجاد ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب  
من لا یحضرہ الفقیہ اسی طرح اہل حدیث اور حنفیوں کے  
اختلاف کا ذکر بھی آپ نے یہی مثل کیا ہے۔ ان میں بھی دراصل  
کوئی اختلاف نہیں۔ احادیث میں جو آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم نے صحابی کو اذان کے کلمات سکھائے، جب  
اشهد ان محمد رسول اللہ

تعلیم کر چکے تو فرمایا پھر کہ اس "پھر کہہ" کی تشریح میں اختلاف ہے



اہل حدیث اور شافعیہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ محمد رسول اللہ  
کہہ کر کلمہ

اشھدان لا الہ الا اللہ

سے پھر شروع کرے۔ حنفی کہتے ہیں اُس نے ذرا پست آواز سے  
کہا تھا اس لیے اُس کو کہا پھر کہہ، یعنی بلند آواز سے کہہ۔ اہل حدیث  
کہتے ہیں الفاظ و ہر انے کا حکم فرمایا۔ غرض الفاظ سب کو مسلم ہیں،  
تشریح میں اختلاف ہے۔ اس معمولی سے اختلاف سے اگر یہ نتیجہ  
برآمد کرنا صحیح ہے کہ اسلامی اذان من گھڑت ہے تو آپ لوگوں کے  
اختلاف سے کیا نتیجہ نکلنا چاہیے۔ کہ آپ سب لوگوں کی نماز ہی  
من گھڑت ہے۔

مولوی صاحب!

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

آئینہ دیکھیے گا ذرا دیکھ بھال کر

عارفانہ نکتہ

ناظرین ان دونوں اذانوں دہل حدیث اور اہل قرآن کی بابت  
ایک نکتہ بتاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ اذان سے مقصود یہ ہے کہ  
دور کے لوگ سنکر نماز کو پہنچیں۔ حدیثی اذان کے الفاظ میں مدات



کی وجہ سے ایسی بلندی پیدا ہو سکتی ہے جو مقصود کے موافق ہے۔  
چنانچہ مؤذن جب کہتا ہے:

اللہ اکبر

حتى على الصلوة وغيره

تو کافی دُور آواز چلی جاتی ہے۔

برخلاف اس کے مولوی قرآنی کی پیش کردہ آیات کو جہر سے بہر  
پرٹھ کر بھی سنیں اتنی بلندی کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس سے عارفانہ  
نگاہ میں ثابت ہوتا ہے کہ خدائے پاک کو ان آیات کے الفاظ  
اذان میں استعمال ہونا منظور ہی نہیں۔ مولوی حشمت علی صاحب اگر  
عارف ہوں گے تو اس عارفانہ نکتہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مکتوبین حدیث کا رسالہ اشاعت القرآن ان دنوں بڑی سرگرمی سے حدیث  
پر حملہ آور تھا۔

## بہتان از اہل قرآن!

ناظرین آگاہ ہوں گے کہ فرقہ اہل قرآن (منکر حدیث) نے اپنے

۱۱ اہل حدیث ۳۳ جون ۱۹۴۲ء



رسالہ "اشاعت القرآن" میں ایک سلسلہ جاری کر رکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ احادیث قرآن کے برخلاف ہیں، لہذا غلط ہیں چنانچہ ۷ نمبروں تک اس کا جواب دیا گیا۔ آج نمبر ۸ کا جواب دیا جاتا ہے۔  
نوٹ:

بہتان پہنچنے میں اُدھر ہی سے دیر ہوتی ہے، ہم تو ہمہ تن منتظر رہتے ہیں اور بزبان حال کہتے ہیں۔

تیر پتیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے!  
سینہ کس کا ہے میری جان، جگر کس کا ہے

قرآن مجید پارہ ۱۵، رکوع ۱۲ میں ارشاد ہے۔  
قُلْ اٰمِنُوْا بِہٖ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْعِلْمَ  
مِنْ قَبْلِہٖ اِذَا یُنۡزَلُ عَلَیْہِمۡ یَخِرُّوْنَ لِلذِّقَانِ  
فَیَجۡدُوْا وِیۡقُوۡلِنَا سُبۡحٰنَ رَبِّنَا اِنْ کَانَ وَعۡدُ  
رَبِّنَا لَمَفۡعُوۡلًا

یعنی اے نبی! تو کہہ دے کہ تم (مشرکین عرب) اس قرآن کو مانو یا نہ مانو جن لوگوں کو اس قرآن سے پہلے خدا کی طرف سے علم ملا ہے یعنی علمائے یہود و نصاریٰ، ان پر حسباً یہ قرآن پڑھا جاتا ہے تو کھوڑیوں پر گہ پڑتے ہیں



اور کہتے ہیں سبحان ربنا "..... الخ

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مومن بندے جب قرآن مجید سنتے ہیں تو غفلت اور بے پروائی سے نہیں سنتے بلکہ ولی توجہ سے سن کر خدا کی طرف جھکتے ہیں، یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو زمانہ رسالت میں یہود و نصاریٰ کے عالم خدا سے ڈرنے والے

تھے اس تفسیر کی تائید دوسری آیت میں یوں ملتی ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخْسَرُوا  
عَلَيْهَا صُمًّا وَعَعْيَانًا

(پ ۱۹ ۱۷۶)

یعنی خدا کے صالح بندے جب قرآن سنتے ہیں تو وہ بہرے اور اندھے ہو کر نہیں سنتے بلکہ بگوش ہوش اور توجہ قلبی سنتے ہیں۔

ایک مقام پر مومنین کے قرآن سننے کا نقشہ ان لفظوں میں

بیان فرمایا ہے۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَى  
أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ  
الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ  
وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ



وَنُطْمَعُ أَنْ يَدْخِلَنَا رَبَّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ

(پ ۷ : ۱۱)

ان سب آیات کو یکجا لیا کر پڑھیں تو یہ امر تجویزی ذہن نشین ہوتا ہے کہ ان آیات سے یہ مراد ہے کہ مومن بندے کے قرآن مجید سن کر اپنے نفس کو عمل پر آمادہ کرتے اور عامل پاتے ہیں چنانچہ ایک اور مقام پر ان سب کا نتیجہ ان لفظوں میں فرمایا ہے۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْكِتَابِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِي  
تَقْشَعْرِمًا مِنْهُ جُلُودٌ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ  
ثُمَّ تَلِينَ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ

اللَّهُ

خدا نے سب سے اچھا کلام در بصورت قرآن شریف اتارا ہے جو ملتا جلتا ہے بڑا اثر کرنے والا جس کے سننے سے پروردگار سے ڈرنے والوں کے چمڑے کانپ اُٹھتے ہیں پھر وہ ان کے چمڑے اور دل اللہ کے ذکر کی طرف جھک جاتے ہیں۔

ہاں اسی آمادگی اور استعداد و قلب کی حالت میں ان کے منہ سے کبھی سبحان ربنا نکل جاتا ہے کبھی ملک السموات پر غور کرتے ہوئے ربنا ما خلقت هذا باطلا پکار اُٹھتے ہیں۔ یہ الفاظ کو مختلف



پہلے معنی ان کے متحد ہیں بقول ۵

عبارتنا شتوا وحسنک واحد

”ہمارے الفاظ مختلف ہیں تیرا حسن ایک ہی ہے“  
مولوی قرآنی نے اس آیت کا مطلب یہ سمجھا کہ نماز کے رکوع  
اور سجود میں سبحان ربنا کہنے کا حکم ہے اور صحیح بخاری اس کے خلاف  
ہے چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

”یعنی آیت صدر میں انبیاء اور رسل سلام علیہم جن کو علم الہی  
پہلے دیا گیا تھا ان کا جہاں بتلایا ہے کہ جب ان کی جماعت  
میں قرآنی آیات کی تلاوت ہوتی تو وہ منہ کے بل رکوع اور  
سجدے میں گرتی اور کہتے سبحان ربنا یعنی ہمارا رب  
ہر طرح کے عیب و نقصان سے پاک ہے اور ضرور ہی  
ہمارے پروردگار کے ہر ایک وعدے پورے کیے  
گئے ہیں۔ اس آیت سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو گیا کہ پہلے انبیاء  
رکوع سجدہ میں قرآنی تسبیح ہی پڑھتے تھے جس کے الفاظ  
بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرما کر ظاہر کر دیا کہ حسب حکم  
فہدنا ہم اقتداء یعنی کل رسل اور انبیاء کے راستہ کی  
اقتداء کیا کرو۔ اور رکوع سجدہ میں یہی تسبیح پڑھا کرو۔ جو وہ



پڑھتے تھے، لہذا محمد رسول اللہ سلام علیہ اور آپ کی عمت  
صحابہ، و ہاجر و انصار اپنے ہر ایک رکوع اور سجدوں میں یہی  
تسبیح موافق کتاب اللہ پڑھتے رہتے۔ بفتحوائے  
آیت:

لَا تَكُلْفُ إِلَّا نَفْسُكَ وَحِرَافُ الْمُؤْمِنِينَ (پ ۱۸۶)  
یعنی ادل قرآن پر خود عمل کرو اور پھر دوسروں کو وعظ کرو  
اشاعۃ القرآن بابت جون ۱۹۲۲ء

## اہل حدیث

بہت خوب اپنے معنی پر ہمارے سوالات لہجور سنئے اور  
ہماری طرح نفس و آن سے ان کے جواب دیکھے۔  
۱۔ آیت میں یَخِشُونَ لِلذَّنِّ سے جس کا لفظی ترجمہ ہے،  
”کھوڑیوں پر گرتے ہیں“  
آپ نے جو اس آیت میں رکوع بھی داخل کیا ہے۔ کیا رکوع  
میں کوئی شخص کھوڑیوں پر گرتا ہے؟  
۲۔ کیا جب کبھی قرآن مجید پڑھا جائے تو من کو چاہیے کہ بقول  
آپ کے رکوع و سجدوں میں گریڑے؟



پھر تو کوئی شخص کھڑا رہ کر قرآن مجید نہیں سن سکتا حالانکہ آپ بھی نماز میں سورہ فاتحہ اور دوسری کوئی چھوٹی بڑی سورت پڑھتے ہوں گے۔ کیا آپ کے پڑھتے وقت آپ کے مقتدی سب رکوع سجدوں میں گرے ہوتے ہیں؟

۳۔ اس آیت سے پہلے بیہوش کا ذکر آپ نے کس طرح رکھا تاکہ لفظ کا ترجمہ ہے؟ بخردن تو مضارع حال کا صیغہ ہے۔

۴۔ بقول آپ کے اس آیت میں سبحان ربنا کہنے کی تعلیم ہے تو کوئی شخص بجائے سبحان اللہ کہے تو آپ کے نزدیک گناہ گار ہوگا؟ ذرہ دوسری آیت سُبْحَانَ اللَّهِ حِينَ تُمْسُونَ وَحِينَ تُصْبِحُونَ اَلَا يَتَذَكَّرُ اُولٰٓئِكَ

۵۔ آپ نے خود اور آپ کے امام مولوی عبد اللہ چکری الہوی نے بھی اپنی صلوٰۃ القرآن میں رکوع کی دعائیں یہ لکھی ہیں:

الحمد لله الذي لم يتخذ ولدا ولم يكن له شريك في الملك ولم يكن له ولي من الدن

ربنا اصراف عنا عذاب جهنم ان عذابها كان غراما انما ساءت مستقرا ومقار  
ربنا وسعت كل شيء...



دبنا هب لنا من ازواجنا الخ

اب بتائیں ان آیات کا رکوع سجود میں پڑھنا کس کس آیت سے استنباط کیا ہے۔ اگر آیت سے استنباط نہیں کیا تو اور شخص اور الفاظ پڑھ سکتا ہے؟

چونکہ آپ نے اس آیت کو یقیناً رکوع سجود کے متعلق سمجھا ہے لہذا آپ نے صحیح بخاری کی حدیث پر منہ کھول کر بڑی بے خوفی سے اعتراض کیا چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

”بخاری صاحب نے قرآن کے خلاف قرآنی الفاظ کو

ہی مقدم و مؤخر کر کے ایک ایسی تسبیح بنائی کہ جس سے

قرآن مجید کی تحدی میں نقص پیدا ہو اور فاتوا بسودیٰ

من مثلہ میں جو قرآن کی مثل کا مطالبہ سے وہ ٹوٹ

جائے۔ در نہ بخاری صاحب کو کیا ضرورت تھی کہ قرآنی تسبیح

جو خدا سے تعالیٰ کے کلام پاک میں موجود تھی اس کو چھوڑ کر

اس کے مقابل انسانی صنوت سے تسبیح بنائے اور اس

کی نسبت رسول اللہ کی طرف کرتے کہ عائشہ صدیقہ

سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم اپنے رکوع سجود میں انسانی

خانہ ساز تسبیح پڑھتے تھے اور اس کو قرآنی تسبیح ہی خیال کرتے تھے یا قرآنی تسبیح



بذریعہ جبریل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس  
 آئی تھی آپ کے لیے بحوالہ آیت ذیل کے کافی نہ تھی  
 اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ  
 اِنَّا فِىْ ذٰلِكَ لَرَٰحِمَةٌ وَّذِكْرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ

(پ ۲۱ ص ۱۶)

لوگوں کے مقابل تو یہ اشتہار دیا جائے کہ اے لوگو!  
 کیا تمہارے لیے یہ قرآن کریم جو اعجازی رنگ میں نازل  
 ہوا ہے اور اس میں ہر ایک مسئلہ مکمل اور مفصل ہے اور  
 تم پر اس کی تلاوت نماز اور غیر نماز میں عموماً فرض ہے۔  
 یہ کافی نہیں جو اس کے علاوہ کوئی انسانی مصنوعی بات  
 طلب کرتے ہو اور اس کے مومن بنتے ہو اور قرآن مجید  
 تو ایما ندار قوم کے لیے من جانب اللہ رحمت اور نفاذ اور نور  
 اور ہدایت اور امام الزمان ہے۔ بخاری صاحب نے  
 جس قدر غیر قرآنی اذکار نماز میں تخریب کیے ہیں وہ قرآنی الفاظ  
 کی ہی تخریب ہے تاکہ قرآن کریم کا وہ دعویٰ کہ ”میں بے مثل  
 ہوں“ ٹوٹ جائے اور تیس پارے بخاری کے قرآن مجید کے  
 تیس پاروں کی طرح اس کی مثل ہو جائیں چنانچہ بخاری کے



عاشق یہی ایمان رکھتے ہیں کہ بخاری مثل قرآن ہے اور قرآن  
مجمل ہے اور بخاری اس کی تفسیر ہے اور قرآن پر حاکم ہے۔  
اشاعة القرآن جون ۱۹۲۲ء

## اہل حدیث

قرآن ایسی سمجھ کے اور ایسی فہانت پر آپ فرماتے ہیں نام  
بخاری نے قرآن کی تفسیر توڑنے کا ارادہ کیا ہے (اف رے افرا،  
انّ الذین یؤذون المؤمنین والمؤمنات بخیر منا  
اکتسبوا فقد احملوا بہتانا واثما ہینا)  
سنیہ جناب احمدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں جو آپ نے  
بھی لکھے ہیں:

یکثر ان یقول فی رکوعی سبحودک سبحانک اللہم وبحمدک  
اللہم اعف عننا ولقرآن

یعنی بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت بہت دفعہ رکوع،  
سجود میں یہ دعا پڑھتے تھے جس کا ترجمہ یہ ہے "اے اللہ تو پاک  
ہے اپنی تعریف کے ساتھ اے اللہ مجھے بخش دے۔ اس پر سننے  
میں آپ قرآن پڑھ کر کہتے "آپ روایت مذکورہ پر غور کرتے تو خوشی



سے پھولے نہ سماتے اور بجائے بدگوئی کرنے کے اچھلتے ہوئے  
 کہتے کہ امام بخاریؒ بھی اہل قرآن تھے کیونکہ اُنھوں نے ان الفاظ  
 کے پڑھنے کو قرآن سے مستنبط کیا ہوا نقل کیا ہے جس سے ثابت  
 ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں ان کا ماخذ قرآن مجید میں ہے اس لیے  
 آنحضرت نے پڑھے اور امام بخاری نے نقل کیے۔

اب ہم دکھاتے ہیں کہ قرآن مجید میں کہاں ان الفاظ کا ماخذ ہے  
 اور ہمارے استنباط کو اپنے خالی دعویٰ سے مقابلہ کر کے  
 دیکھو کہ صحیح کون سا ہے ارشاد ہے :

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا  
 خدا کے نام کی تسبیح پڑھا کر اور بخشش مانگا کر کہ بیشک  
 وہ بڑا قبول کرنے والا ہے۔

اس آیت میں دو کاموں کے کرنے کا حکم ذکر ہے تسبیح اور  
 استغفار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی دو حکموں پر عمل کرنے  
 کو رکوع سجود میں فرماتے:

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي

کہیے! آیت پر عمل کیا کیا پڑا کیا؟ ہاں یہ کہا جائے گا کہ ہماری پیش کردہ  
 آیت میں رکوع سجود کی تعین نہیں پھر حدیث نے تعین کیوں کی۔



اس کا جواب یہ ہے کہ غایت مافی الہاب تعین موضع نہ ہونے سے حکم عام سے کا یعنی ہر مقام میں یہ الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ ان ہر مقام میں سے رکوع، سجود بھی تو ہے نتیجہ صاف ہے کہ رکوع، سجود میں ان الفاظ کا پڑھنا تو ہر محل ہے۔ البتہ دوسرے مقامات پر بھی پڑھے بلکہ جہاں تک ہو سکے۔ ہر وقت تسبیح اور استغفار کرے۔ کون مانع ہے؟

حدیث سے بہت کوششیں کو جن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا مختصر حال ملاحظہ ہو

## منکرین حدیث کی نماز

منکرین حدیث کے رسائل کا جواب

سرکنم شکوئی اگر تاب شنیدن داری

سینہ بشکافتم اگر طاقت دیدن داری

ناظرین! آج تک تو منکرین حدیث کو ہم اہل قرآن کہتے اور لکھتے

۱۳ فروری ۱۹۲۵ء



تھے اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے تھے۔ آج کل چاروں سے  
منکرین حدیث کے نکلتے ہیں۔

۱۔ اساعرو، القرآن لاہور سے

۲۔ بلاغ امر تیسرے

۳۔ بلاغ القرآن گوجرانوالہ سے

۴۔ ضعیف لدھیانہ سے۔

ان میں سے ۲ اور ۳ نے کھلے نکتوں میں اہل قرآن کہلانے  
سے انکار کر دیا۔ باقی دو نے اپنا نام ”اہل الذکر والقرآن“ لکھنا  
شروع کیا۔ اور کاموں میں ان کا اختلاف کتنا ہی ہو مگر حدیث کے  
انکار میں سب شریک ہیں۔ اس لیے اہل قرآن البان کے یہ جامع  
لقب نہ رہا چونکہ انکار حدیث بلکہ ابطال حدیث مشترک کام ہے  
اس لیے ہم نے اس اشتراکی وصف کی وجہ سے سب کو یکجا کرنے  
کے لیے ”منکرین حدیث“ کا عنوان لکھا ہے۔ اس کے سوا ہمیں  
کوئی اور عرض نہیں۔

کہ منکرین حدیث نبوی کو چھوڑ کر

اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے | حیران پریشان ہیں اس حیرانی میں

کچھ کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان کی ابتدا سے آج تک کی کہانی قابل دید و شنید



ہے۔

ناظرین کو یاد ہو گا کہ "الحدیث" مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۲۲ء میں اپنی  
اس کے بعد مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء میں ہم نے ایک مضمون لکھا  
تھا جس میں اہل قرآن اور اہل حدیث کی نزاع میں تفسیح بتانی تھی جس کا  
خلاصہ یہ ہے:

"منکرین حدیث احکام اسلام کو قرآن مجید ہی میں مفصل اور  
مشریح کہتے ہیں۔ اس لیے وہ احکام مندرجہ ذیل کی تفصیل  
اور تشریح دکھائیں وہ احکام یہ ہیں، نماز، زکوٰۃ، روزہ،  
خراج، اطاعت امیر قوائین، تعزیرات وغیرہ۔ سب سے مقدم  
نماز ہے، دیگر احکام بھی ضروری ہیں۔"

۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء

اس درخواست کے بعد ہم نے "حنیف" کو جس نے حریشی  
صلوٰۃ سے انکار کر کے اسلامی نماز قرآن سے دکھلانے کا اعلان کیا تھا،  
مخاطبہ کر کے ۱۹ دسمبر کے اہل حدیث میں اسلامی نماز کا مطالبہ کیا۔  
اس کے متعلق ہمارے الفاظ یہ تھے۔

"ہم اول سے متمنی ہیں کہ اسلامی حیثیت سے ہم اسلامی،  
(قرآنی) نماز سنیں پھر دیکھیں کہ جو نماز ہم مسلمان متواتر پڑھتے



چلے آئیں، قرآن مجید اس کی شہادت دیتا ہے یا نہی نماز  
کی“ (الحديث ۱۹ و سمر ص ۳)

ہماری اس معقول و خواست پر منکرین حدیث کا رسالہ ”بلاغ القرآن“  
گوچرانوالہ نہایت غلط نتیجہ نکالتا ہوا لکھتا ہے۔

”اگر جناب زاہدیت کا اپنی نماز پر وثوق اور ایمان ہوتا تو آپ  
پیشاب ہو کر درخواستیں نہ کھینچتے اور نہ لکھتے کہ (دیکھیں کہ جو  
نماز ہم مسلمان متواتر پڑھتے آئے ہیں قرآن اس کی شہادت  
دیتا ہے یا نہی نماز کی“ (جنوری ص ۳۱)

اے جناب! ہماری درخواست تعلیم قرآنی کے ماتحت  
الحديث ہے ہوا رشاوی۔

قُلْ فَاتَّبِعُوا كِتَابَ مَنْ عِنْدَ اللَّهِ هُدًى أَوْ هَدَىٰ  
مِنْهُمَا أَتَّبِعُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (پ ۸۶)

”اے رسول! علیہ الصلوٰۃ والسلام، تو مخالفوں کو کہہ دے تو ریت  
اور قرآن سے زیادہ اچھی ہدایت والی الہی کتاب لاؤ تو میں اسی  
کی پیروی کروں گا“

کیا حضور خدا کا اچھا داعی، کو بھی قرآن مجید پر ایمان نہ تھا جو  
دوسری کتاب مانگ رہے ہیں۔ اے جناب! علم بیان میں اس کو



تعجیاز کہتے ہیں۔

کہلا کر قرآنی تعلیم سے ناواقفی اور اس پر

اہل قرآن اعتراض؟

گہر تو قرآن بریں منط خوانی!

بہری رونقِ مسلمانی!!

امرتسری نے اس سے بھی زیادہ گل کھلائے۔ حالانکہ اس کو  
بلاغ ہماری اور خواست کی قدر کرنی چاہیے تھی۔ کیونکہ اول مخاطب  
 وہی تھا اس نے ہماری نسبت ایسے ایسے الفاظ لکھے جو ہمارے  
 وہم و گمان میں بھی نہ تھے کہ بلاغ جیسا مٹین نگاری کا مدعی ایسا  
 لکھے گا اس نے شروع تمہید میں صراحتہ اور اشارہ چوہ مرتبہ لکھا  
 کہ اہل حدیث قرآن کو ناقص کہتا ہے چنانچہ پہلی دفعہ کے اس کے الفاظ  
 یہ ہیں۔

”اڈیٹر الحدیث ۲۱ نومبر میں ”بلاغ“ سے دریافت فرماتے  
 ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

اگر قرآن مجید مفصل مشرح اور مکمل ہے تو اس میں

نماز، روزہ، حج وغیرہ احکام کی ضرورت پیش کرو۔

مولوی صاحبہا کے قرآن کو ناقص ماننے کا سبب ہماری



سمجھیں نہیں آیا“

۱۵ نومبر ۱۹۷۱ء لغات ص ۱۱

مورخہ ۱۲ نومبر میں ہم کو تو یہ لفظ نہیں ملے جو اڈیٹر صاحب  
 اہلحدیث پر مشافہت کے ہمارے نسبت لکھے ہیں چنانچہ ہم نے شروع  
 مضمون میں اہل حدیث ۱۲ نومبر سے اصل مطالبہ کے الفاظ نقل کر دیے  
 ہیں۔ اڈیٹر صاحب بلاغ کو اگر ملے ہوں تو مہربانی کر کے آئندہ پرچے میں  
 نقل کریں جس میں قرآن مجید کے ناقص اور غیر مکمل ہونے کا ذکر ہوا اور  
 اگر یہ الفاظ ہمارے کسی تحریر میں نہ ملیں تو دوسری مہربانی یہ کریں کہ اس  
 آیت قرآنی کی تفسیر فرمادیں جو یہ ہے:

وَالَّذِينَ يُؤَدُّونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بغيرِ مَا  
 كَتَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا

(پ ۲۲ ۶۶)

ترجمہ ہم کیسے دیتے ہیں، تفسیر آپ کے سپرد کرتے ہیں،  
 (یعنی) جو لوگ کسی مومن کو بغیر گناہ کیسے کے ایذا دیتے ہیں، وہ  
 بہت بڑا بہتان اور واضح گناہ اپنے ذمہ لیتے ہیں۔“

۱۵ انکار حدیث کے جدید علمبردار آج بھی اسی روش پر گامزن ہیں۔ مؤلف -



اڈیٹر صاحب بلاغ!

بہرور حشر پر سبند خسر و را چہ کشتی!  
 چہ خواہی گفت قربانت شوم تا من ہماں گویم  
 اصل یہ ہے کہ اڈیٹر صاحب بلاغ کو شاید معلوم نہیں کہ ناقص  
 اور مجمل کجمل اور مفصل میں کیا فرق ہے اس لیے ہم اس کی دو مثالیں  
 پیش کرتے ہیں علامہ ابن صاحب نے "کافیہ" میں کلمہ کی تعریف  
 یوں کی ہے:

الكلمة لفظ وضع لمعنى مفساد

اس تعریف کی تفصیل شارح جامی نے کئی سطروں میں کی ہے۔ مگر  
 مگر مصنف "تہذیب النحو" نے علامہ موصوف کی تعریف کو بجائے  
 خود مفصل جان کر اس کو یوں جمل کیا:

الكلمة لفظ "موضوع"

علماء نحو سے پوچھیے کہ مصنف "تہذیب النحو" کی تعریف ناقص ہے  
 یا جامع مگر جمل۔

غالباً آپ کو یہ مثال سمجھنے میں وقت ہوگی کیونکہ یہ ایک ایسے علم  
 کی مثال ہے جس سے اڈیٹر صاحب غالباً واقف نہیں۔ اس لیے  
 قرآن مجید ہی سے مثال پیش کی جاتی ہے:



کچھ شک نہیں کہ مسئلہ توحید کی جو تفصیل قرآن مجید نے کی ہے کسی کتاب نے نہیں کی اس ساری تفصیل کے دریا کو کلمہ شریف  
لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

کے کوزہ میں بند کر دیا ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہمارے رسالہ "کلمہ طیبہ" سے کیجیے تو کیا کلمہ لا الہ الا اللہ توحید کے بیان میں ناقص ہے؟ ہرگز نہیں ہاں مجمل ضرور ہے۔

ان دو مثالوں سے اہل انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ ہم نے جو کہا تھا کہ احکام شرعیہ کے بیان کرنے میں قرآن شریف مجمل ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن ناقص ہے جیسا کہ اڈیٹر صاحب "بلاغ" نے ہم پر افترا کیا ہے اور ان کے امام جی نے بعض اجباب سے زبانی بھی ذکر کیا ہے سچ ہے

۵ کہ من غائب قولاً صحیحاً

افتہ من الفہم السقیم

یہ تو ہے تہید اب ایم اصل مطلب کی بات کہتے  
رجوع بمطلب ہیں۔

انکار حدیث کی آواز ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید احمد خاں بانی علی گڑھ کالج نے اٹھائی تھی جن کے مقابل اس وقت



بھی گروہ اہل حدیث رہا چنانچہ مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی مرحوم نے لکھتا رہنا میں اشاعت السنہ میں لکھے جن کی سرخی تھی ”نیچری اور حدیث نبوی“ مگر باوجود انکار کے سرسید مرحوم میں یہ بات خاص تھی کہ وہ عبادت اور ارکان میں اسی طریق کے قائل تھے جو متوازیات اہل اسلام میں چلا آیا ہے یعنی نماز وغیرہ اسی طرح او کہتے تھے لیکن جب یہ آواز مولوی عبداللہ چکڑالوی کی معرفت پنجاب میں آئی اور منکرین حدیث ایک جماعت کی صورت میں نظر آنے لگے تو انھوں نے نماز وغیرہ احکام بطرز جدید جاری کیے۔ آخر کیوں؟

نہ پیر دئی قلیس نہ فرہا و کہیں گے

ہم طرز جنوں اور ہی ایجا و کہیں گے

چنانچہ مولوی عبداللہ چکڑالوی (اقل منکرین حدیث پنجاب) نے ایک نمانکی کتاب شائع کی جس کا نام رکھا ”صداۃ القرآن ما علم الرحمن بایات الفرقان“ اس نام ہی سے ظاہر ہے کہ جو کچھ اس میں تعلیم ہے وہ مصنف کے نزدیک بعینہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ بہر حال وہ ترتیب ارکان یہ ہے:

۱۔ قیام میں دامنہ ہاتھ بائیں ہاتھ کی کہنی تک بلا کروٹوں ول پر رکھے جائیں۔



۲۔ رکوع

۳۔ قومہ میں قیام کی طرح اٹھ بانڈھے جائیں۔

۴۔ سجدہ اول

۵۔ جلسہ

۶۔ سجدہ دوم

ان چھ ارکان پر منح ان کے اذکار کے بعد میں آئیں گے ایک رکعت ختم ہوتی ہے۔

۷۔ قعدہ دو رکعتوں کے بعد کیا جائے۔

۸۔ ہر رکن کے شروع کرنے کے وقت تکبیر کہی جائے جس کے ساتھ ہی محرموں کی مانند دونوں کان پکڑے جائیں۔

۹۔ سلام دائیں بائیں طرف کا جو آخری قعدہ کے اخیر ہوتا ہے۔

(صلوٰۃ الرحمن مولوی عبداللہ صاحب)

یہ ہے ترتیب ارکان جو قریب قریب وہی ہے جو قائلین حدیث کہتے ہیں۔ منکرین حدیث کے قلم سے حدیثی تعلیم دیکھ کر بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے۔

منکر جنی بودن اور ہم رنگ مستان زیستن

اب سنیہ قعد اور رکعات



دو فرض	فجر
چار فرض	ظہر
چار فرض	عصر
تین فرض	مغرب
چار فرض	عشاء
دو فرض	جمعہ
دو فرض	عیدین
دو نفل " (محولہ بالاصح)	تہب

اس کے بعد اوقات نماز لکھے ہیں جو عام طور پر اہل اسلام مخصوصاً  
اہل حدیث میں ہیں۔ پھر اذکار نماز لکھے ہیں:  
تکبیر اولیٰ:

وَأَنَّ اللَّهَ هُدَا لَعَلِّي الْكَبِيرُ  
قیام کی دعاؤں کو وصول میں تقسیم کیا، فرضی اور نفل  
فرضی:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ (آخر تک)

نفلی:

عَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْنَا (آخر تک مع فاتحہ)



تکبیر رکوع :

وہی تکبیر اول وَأَنَّ اللَّهَ

آخر تک

ذکر رکوع :

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعَزَّةِ

آخر تک

سجدہ :

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا

وغیرہ

انجاء اہل حدیث ۲۲ جنوری ۱۹۰۴ء میں اس نماز پر تنقیدی مضمون

نکلا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ نے جو موقع بموقع آیات لکھی ہیں کس کے حکم سے لکھی ہیں کیا قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ ان ارکان میں یہ آیات پڑھا کر وہ نیز تکبیر تحریمہ کے لیے جو یہ آیت رکھی ہے

وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ

اس میں حرف واو سے عطف کس پر ہے اور اِنَّ منصوب کا تعلق کس

کلام سے ہے۔ وغیرہ

اس اعتراض سے بچنے کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ طبع دوم

”صلوة القرآن“ میں بجائے مذکورہ الفاظ کے یوں ترمیم کی گئی۔

مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِ الْبَاطِلِ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ

الْكَبِيرُ



اس ترمیم سے حرف عطف کا سوال تو نہ رہا مگر قرآن کے دیکھنے سے اور  
 بھی مشکل سوال پیدا ہو گیا کیونکہ قرآن مجید میں ما یذعون سے پہلے تو  
 حرف عطف اور اَنَّ مفتوحہ لکھا ہے۔ ساری آیت یوں ہے:  
 ذَلِكْ بِاَنَّ اللّٰهُ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ  
 دُوْنِهِ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهُ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ  
 نوٹ:

ہمارے دوست مولوی حشمت علی صاحب سہ روزی قائم مقام  
 مولوی عبد اللہ چکڑالوی نے بھی اس چکر الوی ترتیب کو بحال رکھا  
 ملاحظہ ہو ان کی صلوة القرآن مطبوعہ ہلالی پریس دہلی ۱۹۱۵ء۔ مگر موصوف  
 قرآن مجید کو کھولنے کی تکلیف کہتے تو انھیں صاف معلوم ہو جاتا  
 کہ آیت موصوفہ کو تکبیر تحریمہ کی جگہ پڑھنے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔  
 گو جہاں الوالیہ جماعت (منکرین حدیث) نے اس سے آگے نہرتی  
 کی۔ ان کے اس بارہ میں تین رسالے میری نظر میں ہیں ایک کا نام  
 ہے "اقیموا الصلوة" دوسرے کا نام ہے "قرآنی نماز تیسرے  
 کا نام ہے "اوقات الصلوة"۔

انھوں نے اوقات نماز بجائے پارچ کے صرف تین رکھے ہیں  
 (۱) صبح (۲) بوقت ولوک شمس جو بقول ان کے مغرب تک ہے۔



(۳) بعد غروب آفتاب غروب شفق تک نماز عشاء اور بس اور رکعتیں  
 بھی ہر نماز کی دو ہی رکھی ہیں در سالہ اتمو الصلوۃ)۔ اذکار نماز میں  
 بھی اپنے پیش رو مولوی عبداللہ چکھڑا لوی سے بہت کچھ اختلاف کیا  
 ہے۔ مثلاً تکیہ کی جگہ یہ آیت رکھی ہے

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا كَبِيْرًا

اسی طرح اذکار قیام، اذکار رکوع اور اذکار سجدہ سب میں اختلاف ہے اور  
 ہونا بھی چاہیے کیونکہ جو مسئلہ خیالی یا اجتہادی ہو اس میں اختلاف  
 ہونا لازمی ہے۔ ممکن ہے ابھی اور بھی اختلاف تھا ہو۔ چنانچہ سنا جاتا ہے  
 کہ ان میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو ہر نماز میں ایک ہی رکعت کے  
 قائل ہیں اور ایسے لوگ بھی ان میں پیدا ہو گئے ہیں جو ایک رکعت میں  
 ایک سجدہ کے قائل ہیں۔ لاہور کے جلسہ ازل قرآن میں ان کا یہ بھی ہتھیار  
 بھی ہوا تھا جس کے صدر مولوی محمد الدین صاحب امرتسری جماعت کے  
 سرگروہ تھے۔ بقول

مختصہ راوردن خانہ چہ کار

ہم کو منکرین حدیث کے اندرونی اختلاف سے کیا مطلب ہمارا  
 روئے سخن تو سب سے یکساں ہے اور ان سب پر سوال ایک ہی  
 ہے کہ آپ لوگوں نے جو ترتیب اور اذکار نماز میں رکھے ہیں، یہ حکم خدا



ہیں یا ایجا و بندہ؟ حکم خدا سے تو اس حکم کے الفاظ بتائیں جس میں مذکور ہو کہ نماز کی رکعات اتنی ہیں، تکبیریں اتنی، اذکار یہ ہیں وغیرہ اور اگر ایجا و بندہ ہے تو

”تعلیم نبوی اس سے بدرجہا افضل ہے“

منکرین کا منشا ہی تعلیم نبوی کو نقصان پہنچانا ہے۔

۹

## منکرین حدیث کا تیسرا فرقہ

ان کا تیسرا فرقہ امرتسری ہے جس کا آرگن رسالہ ”بلاغ“ ہے۔  
 ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء کے المجلدیت میں ہم نے اسی بلاغ پر سوال کیا تھا کہ نماز کے احکام مفصل اور شرح قرآن مجید سے دکھائے اس سوال کے جواب میں اُس نے دسمبر اور جنوری کے پرچوں میں جو مضمون نماز کے متعلق لکھا ہے حقیقت میں وہ ہمارے ہی سوال کا جواب ہے اس لیے ہم ہی اس جواب کی قدر کریں گے دوسرا کون؟

۳۔ بتائیں زلف جاناں کی اگر لیں گے تو ہم لینے  
 بلاغ نے شروع تمہید میں اپنا عقیدہ ان لفظوں میں بتایا ہے:

۴۔ المجلدیت ۲۰ فروری ۱۹۲۵ء



”تسرا ان مجید میں نماز، روزہ وغیرہ امور کا ذکر بالوضاحت  
 موجود ہے، خداوند کریم نے جو احکام مناسبتاً سمجھنے اور پسند  
 کیے وہ سب بتفصیل اپنی مقدس کتاب میں لکھ دیے۔“  
 (بلاغ بابت دسمبر ص ۶۱۳)

یہ بھی صاف لکھا ہے کہ:

”بلاغ“ احمدیہ کو حجت شرعی نہیں مانتا نہ ہی ان کے عمل  
 کو قرآنی احکام کے مثل واجب العمل جانتا ہے۔“

(ص ۱۸)

اس مہید کے بعد ایک مضمون مستقل ”بلاغ“ میں درج ہے جس کا  
 نام ہے ”ایات بینات فی حقیقۃ الصلوٰۃ“ یہ مضمون مرقومہ  
 مفتی محمد الدین صاحب وکیل گجرات پنجاب ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فاضل مضمون نگار نے بڑی سلامت روی  
 سے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے  
 کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے اُس کے ساتھ اگر  
 پابندی اوقات قیام، رکوع، سجدہ وغیرہ ہے تو متعارف نماز ہے  
 ورنہ محض دعا، چٹا پتہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

۱۔ یعنی جس کو مسلمان نماز پنج گانہ کہتے ہیں (ابجدیہ)



» مذکورہ بالا چہار شرط یعنی پابندی اوقات، عبارت،  
 سورہ فاتحہ اور اعتدالی صوت کے ساتھ، ایک قیام ایک  
 رکوع، اور دو سجدہ کا نام رکعت ہے۔ ایسی دو رکعت صلوٰۃ  
 کے معینہ اوقات میں اور اگر فی فرض ہیں « (ص ۱۸، ۱۹)  
 مطلب اس عبارت کا یہ ہے کہ شرعی نماز یہ ہے۔ اوقات معینہ  
 صبح، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء میں بعد وضو کے قیام کرے  
 سورہ فاتحہ پڑھے۔ رکوع کرے اور سجدہ کرے۔ تو ایک رکعت پوری  
 ہو گئی۔

بالکل ٹھیک ہے انا و صدقنا مگر سوال یہ ہے کہ سورہ فاتحہ  
 کا پڑھنا کس آیت سے ثابت ہے؟ سجدوں میں تعدد کسی آیت سے  
 ثابت ہے تو وہ پیش کریں اور اگر اپنا استدباط ہے تو اڑھ پڑھا  
 » بلاغ « کا یہ قول کہ

» نماز کا حکم بالوضو صحت اور بالتفصیل قرآن مجید میں مذکور  
 ہے «

قابل تصدیق نہ رہا۔

علاوہ ازیں اگر آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی آیت سے نماز  
 حکم استدباط کر کے جزو صلوٰۃ بناویں، تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم



کو یہ حق کیوں حاصل نہیں کہ وہ بھی کسی ایسے ایک حکم کو داخل نماز فرمائیں جو امت کی نظروں سے قرآن میں اوچھل ہو یا سر سے قرآن میں نہ ہو مگر بارشاد الہی حکم فرمائیں۔ بجا لیکہ حضور علیہ السلام میں اور امت کے افراد میں روحانی اور قرب الہی کے مراتب میں زمین و آسمان

سے زیادہ فرق ہو پتہ فرمایا:

اِنَّكُمْ لَعَسْرًا فُؤَادًا لَّسَوْفَ تَعْلَمُونَ

نوٹ:

فاضل مضمون نگار نے (جن کی تحریر کو اڈیٹر صاحب "بلاغ" نے ہمارے جواب میں کافی جان کر درج کیا ہے) انہوں نے، تو سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری قرار دیا۔ مگر اڈیٹر صاحب خود اس کے برخلاف، لکھتے ہیں چنانچہ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

» پھر خدا نے فرمایا نماز میں قرآن پڑھو۔ اس کی وسعت، بھی اہل ذکر کے لیے مایہ صدنا ہے اس کی خوبیوں کے اعتراف لکھنے کے لیے دفتر بجا رہیں۔ قرآن مجید میں خدا کی حمد و تعریف ہر ایک رکوع میں موجود ہے۔ اپنی ضروریات کے پیش کرنے کے طریقے بلکہ الفاظ موجود ہیں جہاں سے چاہا ہو جتنا چاہا ہو جو بھی حفظ ہو پڑھو۔ سبحان اللہ و بحمدہ کیسا مفصل مکمل اور



مشرح کلام خوش نظام ہے

الحمد بیٹا:

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیسا مفصل اور مشرح ہے کہ ہم قائلین حدیث  
تو بجائے خود جن کو بقول اویسر بلاغ وحی مخفی (حدیثوں) نے منالطریق  
ڈال رکھا ہے، منکرین حدیث کے مل قرآن مجید کو مفصل اور مشرح  
کہنے والوں کے ایک اعلیٰ امیر مفتی محمد الدین صاحب گجراتی، سے بھی  
یہ تفصیل اور تشریح مخفی رہی جنہوں نے ہر خلاف رائے اویسر صاحب  
"بلاغ" خصوصاً سورہ فاتحہ کا پڑھنا جزو نماز قرار دیا، صدقاً اللہ

شہیداً شاہداً من اہلہا

سورہ فاتحہ کا ثبوت:

یہاں تک ہم لکھ چکے تھے کہ "بلاغ" بابت جنوری پہنچا جس میں  
فاضل مضمون نگار نے خصوصاً سورہ فاتحہ پڑھنے کا ثبوت دیا،  
خلاصہ اس ثبوت کا یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو جگہ استعینہ کے صیغہ  
امر سے طلب امانت کا حکم آیا ہے اور سورہ فاتحہ میں نستعین  
کا صیغہ ہے اس لیے سورہ فاتحہ ضرور پڑھنی چاہیے۔ چنانچہ آپ کے  
اپنے الفاظ یہ ہیں:

”صلوۃ میں طلب امانت کے واسطے بتعمیل آیت



وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ

سورہ فاتحہ کے پڑھے جانے کا ثبوت یہ ہے کہ طلب  
اعانت کے واسطے نستعین کے لفظ کے سوا جس کے

معنی ہیں "اے خدا! ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں"

اور جو سورہ فاتحہ میں ہے اور کوئی لفظ قرآن مجید کی کسی

آیت میں مذکور نہیں ہے نستعین کا لفظ سوائے سورہ

فاتحہ کے اور کسی جگہ قرآن مجید میں نہیں ہے اور استعینا

کا لفظ دو دفعہ قرآن مجید میں آیا ہے اور دونوں دفعہ صلوٰۃ

کے ساتھ مذکور ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ استعانت

کے واسطے جو صلوٰۃ کا ایک خاص مقصد ہے سورہ فاتحہ

پڑھنے کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔"

(بلاغ بابت جنوری ص ۳۷)

المحدثین:

ہم اس تحقیق اور تدبر فی القرآن کی داد دیتے ہیں اور خوشی کا اظہار

کرتے ہیں کہ کوئی جماعت تو پیدا ہوئی جو قرآن مجید پر غور کرنا اپنا فرض

جانتی ہے۔ خدا نے چاہا تو یہی ان کا فعل حسن ان کو قرآن مجید کا اصل

منشور یعنی اربع سوہ حسنہ کی شرف پہنچے گا۔



ہاں جناب! قرآن مجید میں استعینوا کا لفظ دو دفعہ نہیں بلکہ تین دفعہ  
آیا ہے۔ دو مقام آپ نے پیش کیے ہیں تیسرا ہم سے سن لیجیے!  
قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا

(پا ۹۶۵)

”حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا اللہ سے استعانت کرو (مدد چاہو)

اور صبر کرو“

اس تیسرے موقع پر نماز سے تعلق نہیں۔ شائد اسی لیے آپ نے  
اس کو شمار میں نہیں کیا۔ سارا مدار آپ کے ثبوت کا اس فقرے پر ہے  
”طلب استعانت کے واسطے نستعین کے لفظ کے سوا

جس کے معنی ہیں ”اے خدا ہم تجھ سے مدد طلب کرتے ہیں“

اور کوئی لفظ قرآن مجید میں نہیں“ (بلاغ جنوری ص ۲۴)

ہم نے آپ کے اس دعویٰ کو غور سے دیکھا اور پڑھا، تو خدا اس سے  
بہت اچھے اور جامع الفاظ ہم کو قرآن میں دوسری جگہ ملے جو ہم پیش  
کرتے ہیں، مگر ان کے پیش کرنے سے پہلے ایک امر کا اظہار کرنا  
ضروری ہے جو یہ ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے متعلق اہلحدیث کا  
مذہب آپ سے زیادہ مضبوط اور وسیع ہے کیونکہ آپ نے ان معنوں میں



مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنے سے روک دیا ہے (بلاغ بابت جنوری  
ص ۸۸) مگر الحدیث مقتدی پر بھی سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری جانتے  
ہیں۔

اس لحاظ سے تو الحدیث آپ کے مشکور ہیں کہ آپ نے ان کے  
مذہب کی گوساری نہیں ادا ہوئی سی تائید کی، مگر بحث صرف وجہ  
ثبوت میں ہے کہ سورہ فاتحہ پڑھنے کا ثبوت قرآن سے ہے یا حدیث  
نبوی سے۔ الحدیث حدیث نبوی سے ثبوت پیش کرتے ہیں جس کے  
الفاظ صاف ہیں:

لَا صَلَاةَ إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ (الحدیث)

”نماز بغیر فاتحہ کے وجود پذیر نہیں ہوتی“

مسئلہ تو حدیث کا ماننا اور حدیث سے انکار کرنا۔ ع  
مشکری بولن وہم رنگ مستان زیستن

اصل مطلب:

مطلب کی بات یہ ہے کہ آپ کو مدو طلب کرنے کے الفاظ قرآن  
میں نہیں ملے اس لیے ہم وہ الفاظ پیش کرتے ہیں جو بخور و بکھیں تو  
سورہ فاتحہ سے بہت وسیع اور جامع تر ہیں غور سے سنئے:  
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا فَا ان لَّسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا سَابَّانَا



وَلَا تَحْسِبْ عَلَيْنَا اَصْرًا كَمَا حَسَبْتُمْ عَلَيَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبِّنَا وَلَا تُحْمِلُنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاعْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

(پ ۳۸ ع ۸)

”اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو اس کے وبال میں نہ پکڑ۔ اور اے ہمارے پروردگار جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں جس طرح ان پر تو نے ان کے گناہوں کی پاداش میں احکام سخت کا، بار ڈالا تھا۔ ویسا بار ہم پر نہ ڈال۔ اور اے ہمارے پروردگار اتنا بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم کو طاقت نہیں ہم سے نہ اٹھوا۔ اور ہمارے قصوروں سے درگزر اور ہمارے گناہوں کو معاف کہ اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا (حامی و) مددگار ہے تو ان لوگوں کے مقابلہ میں جو کہ کافر ہیں ہماری مدد کر۔“

اس دعا کے الفاظ سورہ فاتحہ کی دعا سے کتنے وسیع اور کتنے جامع ہیں اور ثنائیہ اس دعا کا طلب مدد پر ہے اس لیے اس دعا کو سورہ فاتحہ پر (بجائیت السلمات) کے تزییح سے نیز آپ ان آیات میں سیاق عبارت قرآنی کو دیکھیں تو آپ کو مزید تزییح یوں ملے گی کہ اس دعا کے پڑھنے والوں کی اس سے سابقہ آیات میں تحریر ہے بلکہ یوں



سمجھیے کہ یہ دعا الہامی طور پر پڑھنے کی تلقین ہے جس میں ضمناً قبولیت کا وعدہ ہے چنانچہ ابتداء آیت کا یوں ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ  
 كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَصَلَّتْكُمْ وَكُتِبَ وَرُسُلِهِ لَا  
 نَفِرَقُ يٰبْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا  
 غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ  
 نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَدِيْهَا مَا  
 اَكْتَسَبَتْ

دوسرے یہ، پیغمبر محمدؐ اس کتاب کو مانتے ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر اتاری ہے اور پیغمبر کے ساتھ دوسرے مسلمان بھی یہ سب کے، سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے کہ (سب پیغمبروں کا دین ایک ہے اور کہتے ہیں کہ) ہم خدا کے پیغمبروں میں سے کسی ایک کو رکھی، جدا نہیں سمجھتے (یعنی سب کو مانتے ہیں اور بول اٹھے کہ) اے ہمارے پروردگار! ہم نے (تیرا ارشاد) سنا اور تسلیم کیا۔ اے ہمارے پروردگار! بس (تیری ہی مغفرت) درکار ہے، اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی شخص پر بوجھ نہیں



ڈالتا مگر اسی قدر جس د کے اٹھانے کی اُس کو طاقت ہو جس نے اچھے  
کام کیے تو ان کا نفع بھی اُسی کے لیے ہے، اور جس نے برے کام  
کیے رُان کا وبال بھی اُسی پر۔

اس کے علاوہ انہی معنی کی دعا گزشتہ امتوں کے منہ سے نکلی ہوئی  
اور خداوند تعالیٰ کی قبول کی ہوئی بھی قابلِ غور ہے جو یہ ہے:

وَكَانَ مِنَ نَبِيِّ قَتَلَ مَعَهُ سَابِئُونَ كَثِيرٌ فَمَا  
وَهَنُوا لَمَّا آصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا  
وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ وَمَا كَانَ  
قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا سَابِئَنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا  
وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبَّتْ أَقْدَامَنَا وَالصَّابِرِينَ  
عَلَى الْقَوْلِ الْكَافِرِينَ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا  
وَحَسَنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

”اور بہت سے پیغمبر تو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے  
اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے تو جو مصیبت ان کو  
اللہ کے رستے میں پہنچی اُس کی وجہ سے نہ تو انہوں نے بہت ہی  
ٹاری اور نہ ہی بو داپن کیا۔ اور نہ دشمنوں کے آگے عاجزی رکھا  
اظہار کیا، اور اللہ مصیبت میں اثابت قدم رہنے والوں کو دوست



رکھتا ہے اور سوائے اس کے ان کے منہ سے ایک بات بھی تو نہیں  
 نکلی کہ لگے دعائیں مانگنے کہ اسے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر  
 اور ہمارے کاموں میں جو ہم سے زیادتیاں ہو گئی ہیں ان سے درگزر فرما  
 اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہمارے پاؤں جھائے رکھ اور کافروں  
 کے گروہ پر ہم کو فتح دے۔ تو اللہ نے ان کو دنیا میں بدلہ دیا (سو دیا)  
 آخرت میں بھی اچھا بدلہ دیا اور اللہ خالص دل سے کام کرنے والوں  
 کو دوست رکھتا ہے ۛ

غور فرمائیے:

ان دونوں الہامی دعاؤں کو (جن کی قبولیت کا وعدہ صریحاً اور ضمناً  
 قرآن مجید میں ملتا ہے) چھوڑ کر سورہ فاتحہ کو جو آپ نے جہز و صلوات  
 قرار دیا کیا اس میں تریح مرجوع لازم نہیں آتی؟

نوٹ:

یہ تو ہم کہہ آئے ہیں کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنا ہمارا مذہب ہے مگر  
 سوال آپ کے طرز استدلال پر ہے۔

بالنصاف ناظرین سے ایک سوال:

حضرات! منکرین حدیث اپنے زور علمی سے استنباط کر کے  
 سورہ فاتحہ کو جہز و صلوات بنا دیں تو کیا اس حال میں ان کے منہ سے یا قلم



سے یہ الفاظ کچھ موزونیت رکھتے ہیں کہ  
 ”قرآن شریف احکام شریعیہ کے بیان کرنے میں مفصل اور

مشرح ہے“

پس جب تک آپ مفتی صاحب گجراتی، کسی قرآنی دلیل سے یہ ثابت  
 نہ کر لیں کہ سورہ فاتحہ کو ہماری پیش کردہ وعاوّل پر من کل الوجوه  
 تزییح ہے۔ آپ کا دعویٰ (سورہ فاتحہ کا جزو صلوة ہونا) ثابت نہیں  
 ہو سکتا۔ برخلاف اس کے ہم نے ثابت کر دیا کہ ہماری پیش کردہ وعاوّل  
 کو اس وجہ سے تزییح ہے کہ ان کی قبولیت کا وعدہ صراحتاً یا ضمناً

پایا جاتا ہے، غور سے پڑھیے:

فَاتْمِمْ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ

نکتہ غامضہ:

اسْتَعِينُوا صِيغَةُ امر ہے جس کے معنی ہیں ”دو چاہو“۔ اس کا مقتضاً  
 یہ ہے کہ بندگانِ خدا بھی خدا سے بصیغہ انشاء و درخواست کہیں اور  
 نَسْتَعِينُ بصیغہ انشاء و درخواست نہیں بلکہ بصیغہ حال اظہار حال  
 ہے۔ برخلاف اس کے ہماری پیش کردہ وعاوّل میں درخواست  
 بصیغہ انشاء ہے جو بالکل مطابق ہے حکم استعينوا کے۔ یہ  
 ایک غامض وجہ تزییح ہے جو علم بیان کے اصول پر مبنی ہے ممکن ہے



اس کے سمجھنے میں کسی صاحب کو تکلیف ہو۔ کیوں؟

ع قدر زر زگر بداندا یا بداندا جو مہری

مختصر ترتیب:

قابل مضمون نگار گجراتی نے مختصر ترتیب نماز جو لکھی ہے وہ اُنھی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

”اس طرح صلوٰۃ میں حالتِ قیام میں قرآن مجید پڑھنے کی،

ترتیب یہ ہے کہ پہلے سورہ فاتحہ پڑھے پھر قرآن مجید سے

جتنا آسانی سے پڑھ سکے اتنا پڑھے اور پھر قرآن مجید کی آخری

سورہ پڑھ دے۔ یہ ترتیب چونکہ قرآن مجید کے عین مطابق

ہے اس لیے اس کے درست ہونے میں کسی طرح کلام

نہیں۔“

پس اس ترتیب کا ثبوت بذمہ منکرین حدیث ہے۔ یعنی پہلے سورہ فاتحہ

پڑھے۔ پڑھنے کا ثبوت، نیز تقدم کا ثبوت، پھر قرآن مجید سے آسان

سورہ پڑھے۔ اس کا ثبوت۔ پھر آخری سورہ پڑھے۔ اس کا ثبوت پھر

اس دعویٰ کا ثبوت کہ

”یہ ترتیب قرآن مجید کے عین مطابق ہے۔“

مشرح اور مفصل الفاظ قرآنی سے دینا آپ صاحبان کا فرض ہے۔



دوسری دلیل:

فاضل نامہ نگار نے ایک اور دلیل بھی سورہ فاتحہ کی تخصیص پر پیش کی ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَابِ وَالْقُرْآنِ الْعَظِيمِ

اس آیت میں ایک حصہ سبعاً سات آیات، کل ہے، دوسرا

القرآن العظیم ہے۔ سورہ فاتحہ کی چونکہ سات آیتیں ہیں اس

لیے اسی کو نمازیں پڑھنا چاہیے (ص ۲۵)

جواب:

بالنصف ناظرین! غور کیجئے کیا اسی کا نام ہے مفصل اور شرح“ جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور خواہ مخواہ ہم کو اس دعویٰ کا مخالف بنایا جاتا ہے اگر اسی کا نام آپ لوگ تفصیل اور تشریح رکھتے ہیں جس کو ہم مجمل کہتے ہیں تو کوئی اختلاف نہیں لا مناقشة فی الاصطلاح خواہ مخواہ کی نزاع کیا اور جھگڑا کیا۔

۵ جنگ کردی آشتی کن زانکہ نردعات سماں

این مثل مشہور اول جنگ آخر آشتی

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَابِ کہنے سے کچھ ثابت ہوا تو فقط یہ ہوا کہ سورہ فاتحہ

خاص طور پر قابل ذکر اور بابرکت سورہ ہے۔ لیکن یہ سوال کہ اس کا پڑھنا



جز و صلوة ہے امر و دیگر ہے جو دلیل کا محتاج ہے۔

نوٹ: سورہ کافرون بھی مع بسم اللہ کے سات آیات ہیں۔

تعوذ کا ثبوت:

گذشتہ اقتباس مندرجہ ”الحدیث“ میں جو قرآن مجید کی آخری سورہ پڑھنے کا مشورہ درج ہے اس کی بھی عجیب کیفیت قابلِ یاد و شنید ہے:

قابلِ مضمون نگار نے بتایا ہے کہ قیام نماز میں سورہ فاتحہ اور کوئی اور آسان سی سورہ پڑھ کر بطور تعوذ اور اعوذ پڑھنے کے قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھے کیونکہ یہ بھی قرآن میں حکم ہے کہ جب قرآن پڑھ چکو تو شیطان سے پناہ مانگا کرو۔ چنانچہ فاضل مضمون نگار کے الفاظ یہ ہیں:

”جب سورہ فاتحہ اور قرآن مجید پڑھا جا چکے تو شیطان سے

اللہ تعالیٰ کی طرف پناہ مانگنا ضروری ہے جیسا کہ آیت ذیل

سے ظاہر ہے

فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنْ

الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (۱۰: ۱۰)

پس جب تو قرآن پڑھ چکے تو شیطان مردود سے اللہ کی طرف



پناہ پکڑ۔

چونکہ صلوٰۃ کا مقصد قرآن مجید ہے اور صلوٰۃ میں اور کچھ پڑھنا جائز نہیں اس لیے اعوذ بھی قرآن مجید سے ہی پڑھنا لازمی ہے چنانچہ اسی غرض سے قرآن مجید کے اخیر میں اعوذ کی سورہ درج ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ . مَا يَكُنَّ النَّاسُ . اِلٰهِ النَّاسِ . مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ . الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّتِ وَالنَّاسِ .

اے نبی کہہ میں شیطان کے وسوسوں کی برائی سے خواہ یہ شیطان انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے جس کا کام لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنا ہے۔ نوع انسانی کے پروردگار بادشاہ اور معبود کی طرف پناہ پکڑتا ہوں۔

(بلاغ بابت جنوری ص ۲۶)

الحديث:

امرواق کے طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ اذا قرات القرآن کے معنی ہیں اذا اردت القرآنة یعنی جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو شیطان سے پناہ لے لیا کرو۔ اس کی مثال دوسری آیت ہے:



إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ

(یعنی) "نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو وضو کر لیا کرو!"

مگر ہمیں اس سے کوئی خاص غرض نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ آپ نے بھی اس میں وہی غلطی کی ہے جو عام لوگ کیا کرتے ہیں۔ عام ان پڑھ لوگ جب کسی کی موت سنتے ہیں تو بے ساختہ ان کے منہ سے یہ نکلتا ہے:

قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاَجِعُونَ

اسی طرح بعض بے علم اماان مساجد بعد سلام نماز کرنا کرتے ہیں:

قُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَاَرْحَمْ

جیسا پہلی مثال میں قالوا اور دوسری میں قل بے محل ہے اسی طرح ہمارے مخاطب کے تعوذ میں بھی قل بے محل ہے کیونکہ آپ نے تعوذ کے لیے ساری سورہ قل سے اخیر تک اختیار کی ہے حالانکہ آپ کا مقصد صرف اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ سے شروع ہوتا ہے۔

۱۔ قالوا کے معنی ہیں "انہوں نے کہا" اور قل کے معنی ہیں "دلو کہہ"

اس لیے پہلی مثال میں قالوا اور دوسری میں قل نہیں کہنا چاہیے

(ابن حجر عسقلانی)



لطیفہ :

ہندوستانی علماء اور طلباء میں یہ اصطلاح ہے جس کو عظیم  
کہنا ہوتا ہے۔ کہا کرتے ہیں :

فلاں شخص "قل اعوذ یا" ہے۔

اس کی وجہ شاید یہی ہو کہ قل اعوذ میں بے علموں کو دھوکہ لگ جاتا  
ہے۔ واللہ اعلم

ابھی چند سوال باقی ہیں :

نماز شروع کیوں کر کرے۔ رکوع اسجد کو جاتے ہوئے کیا کہے  
رکوع اسجد میں کیا پڑھے ختم نماز کس طرح کرے۔ یہ سب سوال ہنوز

حل طلب ہیں :

گفتگو آئین درویشی نہ بود!  
ورنہ باتو ماجرا ادا شتیم

مفتی صاحب سے ایک سوال :

ختم کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار مفتی  
محمد الدین صاحب گجراتی سے ایک درو مند انہ سوال کریں۔

جناب! آپ نے بڑی محنت سے ترتیب صلوة قرآن مجید سے  
بتائی جو قریب قریب حدیثی صلوة کے مشابہ ہے۔ ایک شخص آپ



کے فہم کو نہ مان کر خود مبلغ قرآن اول مخاطب رحمن حضور علیہ الصلوٰۃ  
 والسلام کی تعلیم پر عمل کرے اور یہ سمجھے کہ اُن کا فہم قرآن آپ کے  
 فہم سے یقیناً بالاتر اور مقدم سے بلکہ یہ کھلی یقین رکھے کہ جلسے الفاظ  
 قرآن اُن کو سکھائے گئے تھے تفہیم معانی و مطالب بھی خدا کی طرف  
 سے حضور کو کی گئی تھی۔ دوسرا وہ شخص جو آپ کی تحریرات میں آپ کا  
 فہم اور استنباط صحیح جان کر عمل کرے ان دونوں میں سے عند اللہ  
 محفوظ کون ہوگا؟

میرے دل کو دیکھ کر میری وفا کو دیکھ کر  
 بندہ پرور منصفی کو ناحسرا کو دیکھ کر

ہم سے پوچھیے تو ہمارا جواب دو حرف ہے ع  
 عالم ہمت یک طرف آں شروع تنہا بکطرف

مقام حیرت ہے:

اڈیٹر صاحب بلاغ کو ہمارے سوال پر حیرت ہے کہ ہم اُن سے  
 کیوں یہ سوال کرتے ہیں کہ نماز کے مفصل اور مشرح احکام قرآن مجید  
 میں دکھائیں چنانچہ آپ کھٹتے ہیں۔

”یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آپ راہِ حدیث (وہ  
 سب احکام تو بجالاتے ہیں جن کی بابت آپ کو شکوک نہیں



پھر یا تو مولانا صاحب کو ان احکام کی پابندی ترک کر دینی  
 چاہیے اور یا مان لینا چاہیے کہ خدا سے قدوس نے جو کچھ  
 ارشاد فرمایا ہے صحیح اور درست ہے ہم ان احکام کی تعمیل  
 احکام الہی مانتے ہیں اور ہمہ وجہ مکمل جانتے ہوئے کرتے  
 ہیں" (بلاغ ص ۱۷۱)

الحديث:

ہمیں حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہے کہ آپ کو ہمارا مذہب سمجھنے  
 میں تکلیف ہوئی اس سے معام ہو گیا کہ آپ اسی لیے ہمارے مذہب  
 سے منکر ہیں سچ ہے۔

من جہل شیئاً عاداً

یقین ہے جس وقت آپ کو ہمارا مذہب سمجھ میں آ گیا اسی وقت آپ  
 مخالفت چھوڑ کر تسلیم کر لیں گے یہ ساری دیر عدم فہم ہی کی ہے۔  
 پس سنیے! ہم بھی نماز روزہ کی تعمیل احکام الہی جان کر کرتے  
 ہیں اس میں ذرا بھی تڑو نہ کیجیے مگر اس طرح کہ قرآن مجید میں مجمل طور پر  
 حکم دے کر خدا نے اس حکم کی تشریح اسوہ حسنہ (نبی اکے سپرد  
 کر دی اور فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ



”ہمارا رسول تم مسلمانوں کے لیے نیک نمونہ ہے“  
پس اس نمونہ کو دیکھو اور شرعی عمل بجا لاؤ چنانچہ حضور علیہ السلام  
نے فرمایا ہے:

صَلُّوا كَمَا آيْتُمُونِي أُصَلِّ

”تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھ رہے ہو“

یہی معنی ہیں فرمان خداوندی کے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ  
اللَّهُ

اے نبی آپ اللہ کے بندوں کو اطلاع کر دیجیے کہ اگر تم کو اللہ سے

محبت ہے تو میری پیروی کرو خدا تم سب سے محبت کرے گا

چونکہ آپ لوگ اس سورہ حسنہ کی تفہیم کو حجت شرعی نہیں جانتے

اس لیے آپ سے سوال ہوا کہ آپ بقول خود

”مفصل اور مشرح احکام“

قرآن مجید میں دکھائیں۔ کیوں؟ یہ

نگفتہ ندادار و کسے باتوکار!

ولیکن چو گفتی دلش بیار



## مقام افسوس:

مقام افسوس ہے کہ اڈیٹر صاحب بلاغ لکھتے ہوئے بھول گئے کہ وہ خطاب کس سے کر رہے ہیں۔ آخر انھوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو عموماً آج کل مذہبی مکالمات میں کیا جاتا ہے کہ اپنے حلقہ اثر میں مخاطب کی نسبت بدگمانی پیدا کی جائے۔ ہمارا خیال تھا کہ جماعت قرآنیہ میں گو کسی ہی غلطیاں ہوں مگر وہ اس سخت ترین عیب سے پاک ہوگی لیکن افسوس

خود غلط ہو اونچے ماہر اشتیم

قابل اڈیٹر "بلاغ" لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کے متعلق ہمارا صحیح اور بچتر اعتقاد ہے کہ ہمیں اس کے احکام مکمل ملتے ہیں کیوں ملتے ہیں؟ اس لیے کہ اس مقدس کتاب کی تلاوت ہم روایات ما و شما سے خالی الذہن ہو کر کرتے ہیں یہ نہیں کہ پہلے ہی سے حضرت داود علیہ السلام کی ۹۹ بیبیاں تسلیم کر لیں اور ایک نامحرم عورت کا ان کو عاشق کر لیا جائے وغیرہ" (ص ۱۷۷)

المحدث:

اُن کے ظلم! مخاطب کے مذہب اور خیال سے کس قدر بچری



ہے۔ حالانکہ اوپر صاحب کو میری دونوں تفسیروں کا علم ہے خواہ  
 عربی تفسیر کا ذکر آپ ص ۵ پر خود کرتے ہیں مگر دیکھتے نہیں کہ اس تفسیر  
 میں اس قصہ کی تردید کیسے سنگین لفظوں میں کی گئی ہے۔ اگر فرمائیں  
 کہ اس کلام کا روئے سخن آپ سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جو اس  
 قصہ کو صحیح جانتے ہیں تو گزارش ہوگی کہ میرے جواب میں اس کیوں  
 ذکر کیا؟ سائل تو میں تھا میرے جواب میں وہی کہنا چاہیے تھا جس کا  
 میں قائل ہوتا۔ ایسا کبھی ہوا کہ مسلمانوں سے گفتگو کرتے ہوئے،  
 عیسائیوں کے مسلمات کا ذکر خواہ مخواہ بیچ میں لایا جائے۔ آہ!

افسوس سے

ہوا تھا کبھی سر قلم قاصدوں کا؟  
 یہ تیرے زمانہ میں دستور نکلا

## قرآنی نماز بتشریح حدیث

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں نماز کا حکم بڑی تاکید سے

۶ مارچ ۱۹۲۵ء یوم جمعہ المبارک ۱۰ بھدیت



ایسا ہے جس کی صورت یہ بتائی ہے۔

۱۔ قیام کرو۔

۲۔ رکوع کرو۔

۳۔ سجدہ کرو۔

ان ارکان میں تو فریقین راہِ حدیث اور منکرین حدیث متفق ہیں۔ اب صرف ایک رکن باقی ہے جس کو قعدہ کہتے ہیں جس میں التحیات پڑھ کر سلام دیا جاتا ہے۔ یہ ایک فعل ایسا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا صریح ذکر نہیں۔ بل قرآنی سورہ حسنہ ربی صلی اللہ علیہ وسلم اس نے اس کی تعلیم دی ہے۔

قیام، رکوع اور سجدہ کا ثبوت تو قرآن مجید کے صاف الفاظ میں ملتا ہے۔

قَوْمًا لِلَّهِ قَانِتِينَ وَارْكَعُوا وَاسْجُدُوا

ادکار:

ان ارکان میں کیا پڑھنا چاہیے؟

قیام میں سورہ فاتحہ (ضروری) رکوع میں سبحان ربی العظیم

سجدہ کے میں سبحان ربی العظیم

قرآن مجید کے ارشاد: فَاقْرَأْ وَآمِنْ مِنَ الْقُرْآنِ كِتَابِ



میں (اسوہ حسنہ علیہ السلام نے) فرمایا ہے:  
 لا صلوة الا بفاتحة الكتاب  
 "سورہ فاتحہ کے <sup>بغیر</sup> ~~تغیر~~ نماز نہیں ہوتی"

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

فسبح باسم ربك العظيم

حدیث میں اسوہ حسنہ علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"اجعلوها في الركوع"

اس حکم پر رکوع میں عمل کرو

یعنی رکوع میں سبحان ربی العظیم پڑھا کرو

قرآن مجید میں ہے:

سبح اسم ربك الاعلى

حدیث شریف میں ہے

اجعلوها في السجود

یعنی اس حکم پر سجد میں <sup>عمل کرو</sup> رکھو

اسی طرح قعدہ میں پڑھنے کے لائق دعائیں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 اور شرح قرآن (اسوہ حسنہ علیہ السلام) نے سکھائی ہیں جو آج کل  
 کے علماء اہل قرآن کے سکھانے سے بدرجہا بلکہ من کل الوجوه،



افضل ہیں اور افضل ہونی چاہئیں۔

اوقات نماز:

گذشتہ نمبروں میں ذکر آچکا ہے کہ منکر بن حدیث میں سے گوجرانوالہ  
جماعت تین نمازیں کہتی ہے۔ اس مسئلہ میں اُن کا باہمی جھگڑا اور  
مناظرہ بھی ہوا ہے اور ایک دوسرے کا رد بھی کرتے ہیں۔ ہم پر تو  
اس کا کوئی اثر نہیں کیونکہ ہمارے ہاں ویسلی شرعی صرف قرآن ہی نہیں  
بلکہ قرآن اور حدیث دونوں ہیں اس لیے اگر کوئی مسئلہ قرآن مجید میں  
نہ ہو اور حدیث میں ہو تو اس پر عمل کرنے میں ہم پر کوئی اعتراض یا  
سوال نہیں ہو سکتا۔ تاہم چونکہ اوقات نماز کا ذکر قرآن مجید کے عبات  
نظموں میں ملتا ہے اس لیے اُن کا ذکر بھی کیا جاتا ہے۔

اقم الصلوة طرفی النهار وزلفا من الیل

دن کی دونوں طرفوں میں نماز پڑھا کرو اور کچھ تھوڑی رات گئے

دن کی دونوں طرفیں صبح و شام کی نماز اور کچھ رات گئے سے عشاء  
کی نماز مراد ہے۔ اس کی تائید میں یہ آیات بھی پیش ہو سکتی ہیں۔

۱۔ وَتُرَانَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا

۲۔ وَمِنْ بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ

پہلی آیت مندرجہ بالا سے اہل قرآن بھی نماز فجر مراد لیتے ہیں اور سالہ



اقیموا الصلوٰۃ صبرا (گوئی ہم اس کو یقینی نہیں جانتے) اور صلوٰۃ العشا  
سے تو صاف نماز ہی مراد ہے۔

نماز ظہر کی بابت ارشاد ہے:

اقم الصلوٰۃ لدا لوب الشمس

”سورج کے ڈھلنے وقت نماز پڑھا کرو“

چار نمازیں تو یہ ہوئیں۔

کون نہیں جانتا کہ احکام شرعیہ مسلمان پر پوش و اس اور پیداری  
کی حالت میں عائد ہوتے ہیں بے پوشی اور نیند میں تو نہ وہ مخاطب  
ہوتے نہ ادا کر سکتا ہے اس اصول کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں تو نماز  
کا حکم مسلمان کو طلوع صبح سے شروع ہوتا ہے کیونکہ رات کو خدا  
تعالیٰ نے انسانوں بلکہ جانوروں کے آرام کے لیے بنایا ہے چنانچہ  
ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اَرَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرَابًا  
اِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرِ اللهِ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ  
تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ

(پ ۶ ع ۱۰)

اگر خدا تم پر دن لہا کر دے قیامت تک تو کون مہربوب ہے جو تمہارے  
لیے رات پیدا کر دے جس میں تم آرام پاؤ۔



چنانچہ اس آیت کے ماتحت ہر جاہدار رات کو صبح تک آرام کرتا ہے۔

پس سب سے اول ہوش میں جو نماز ادا ہو سکتی ہے وہ صبح کی ہے۔ اس کے بعد زوال شمس کے وقت مغرب اور عشا کا ذکر پڑھے آچکا ہے۔ لا محالہ وہ نماز جس کو قرآن مجید میں صلوٰۃ وسطیٰ کہہ کر حکم فرمایا ہے۔ وہ ان چاروں کے بیچ میں ہوگی جس کا نام عصر ہے قرآنی جامع حکم ملاحظہ ہو:

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوَسْطَىٰ

(پ ۲ غ ۱۵)

یعنی، سب نمازوں کی حفاظت کرو خاص کر درمیانی نماز کی بہت ضرور۔

ہماری تقریر متعلق صلوٰۃ وسطیٰ کو ملحوظ رکھ کر اہل قرآن کی تقریر بھی قابل غور ہے۔ لکھتے ہیں۔

”اللہ عظیم حکیم نے حافظوا علی الصلوات میں عموماً تمام نمازوں پر انگبانی کرنے کا حکم دیا ہے اور نماز وسطیٰ پر خصوصاً کیونکہ عطف خصوص پر عموم سے اس حکم سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس نماز کے ساتھ کوئی خصوصیت



لگی ہوئی ہے وہی صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔ قرآن مجید میں نماز  
فجر کے ساتھ ہی مشہودا کی خصوصیت مذکور ہے۔  
دیکھو:

ان قرآن الفجر کان مشہوداً

(پ ۱۱۵ : ۱۹)

لہذا نماز فجر ہی وسطیٰ ہو سکتی ہے

(رسالہ اقیما الصلوٰۃ ص ۳)

الحمدیث:

اہل قرآن ہم سے تو یہ حکم پر نص قطعی مانگتے ہیں۔ مگر وہ اپنے  
معتقدات اور مسائل پر نص کیا اشارہ بلکہ ولایت وغیرہ بھی پیش  
نہیں کرتے "قرآن الفجر" سے صلوٰۃ فجر مراد لینا کس دلیل سے واجب  
القبول ہے ساری آیت یوں ہے:

اَتِمُّوا الصَّلَاةَ لِذِكْرِ الشَّمْسِ اِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ  
وَقَرَّانَ الْقُرْآنِ اِنْ قُرَّانَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوداً

(پ ۱۱۵ : ۱۹)

اس آیت میں زوال شمس کے وقت نماز ظہر پڑھنے کا حکم  
ہے اور صبح کے وقت قرآن پڑھنے کا اور بس۔



اہل قرآن! قرآن الفجر کی تفسیر جو ہم نے کی ہے اس کی تائید دوسری آیت میں صاف ملتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

أَنْتُمْ مَا أَدْحَىٰ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ

(پ ۲۱ : ۱۱)

جو تمہاری طرف کتاب بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے اس کو پڑھا کرو یہی مضمون اس آیت اور قرآن الفجر کا ہے۔ قرآن الفجر سے جب صلوٰۃ فجر مراد لیتا ہے واجب القبول نہیں تو خصوصیات خود بخود سب مرتفع ہو گئیں۔

علاوہ اس کے اگر نماز فجر صلوٰۃ وسطیٰ ہو تو پہلی نماز مغرب دوسری عشا ہوگی۔ بیسوی فجر، چوتھی ظہر اور پانچویں عصر ہوگی۔ باوجود غیر موزوں ترتیب کے ہمارا مدعا ثابت ہو گا کہ نمازیں پانچ ہیں۔

الحمد للہ۔

---

منکرین حدیث اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حدیث کی وجہ سے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں ان کی اپنی حالت ملاحظہ ہو۔



جب کہ ان کی پیدائش کو الخبی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔

## ۱۱ اہل تشران کی نمازیں

ادسا

ان میں باہمی اختلاف ہے

قاعدے کی بات ہے جب آدمی دو دوٹے چار کہنا چھوڑ  
دے تو پھر دو دوٹے پانچ کہے، سات کہے، نو کہے، سب کہہ  
سکتا ہے۔ اسی طرح اہل قرآن (منکرین حجیت حدیث) نے عمل  
نبوی کو چھوڑا تو اب جو ان کی مرضی میں آتا ہے کہے جاتے ہیں۔  
مولوی عبداللہ حکیم انوی نے نماز میں بہت کچھ ترمیم کی۔ تعداد  
رکعات بدلی۔ دعائیں بدلیں، طریق خواندگی بدلا، مگر اوقات نماز  
برابر پانچ ہی رکھے۔ چنانچہ ان کی کتاب "صلوٰۃ القرآن" دیکھنے  
سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ ان کا زمانہ ابتدائی تھا  
اس لیے ان کے بعد ترقی ہوئی شروع ہوئی تو جو جہاں اہل قرآن  
نے اوقات نماز میں بھی ترمیم کی یعنی بجائے پانچ کے کل تین

۱۔ الحدیث ۲۲، مارچ ۱۹۲۹



رکھیں ملاحظہ ہو ان کی کتاب اقیسوا الصلوٰۃ اس کے بعد امرتسری  
 اہل قرآن (بلانچ پارٹی) نے اور ترقی کی اس نے آٹھ پہروں میں  
 فرضوں کی کل دو نمازیں قرآن سے ثابت کیں چنانچہ بلانچ باب  
 فروری میں اس کو مفصل لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

”آیات قرآنیہ میں نماز کے تین وقتوں کا ذکر ہے۔ ایک  
 رات کی نماز اور دو نمازیں دن کے دو ٹوں طرف یعنی  
 دن نکلنے سے پہلے اور سورج کے غروب ہونے کے  
 پہلے لیکن آیت ”تافلہ لک“ میں رات کی نماز کو نافرما

فرمایا ہے۔ اس لیے باقی دو وقت رہے۔۔۔۔۔

... ہمارے رسول اکرم کو بھی دو ہی نمازوں کا حکم دیا گیا

ہے۔“ (ہدایت فروری ص ۲۶)

اس کے علاوہ ابھی ان میں اور بھی اختلاف پیدا ہوئے ہیں۔  
 ایک جماعت ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے کرتی ہے  
 تو دوسری ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ  
 ایک جماعت نماز میں رکوع کرتی ہے تو ایک ایسی بھی بن گئی ہے  
 جو رکوع نہیں کرتی۔ ایک جماعت ایسی بھی پیدا ہو گئی ہے جو نماز  
 کی حقیقت صرف ذکر الہی کو جانتی ہے۔ رکوع سجدہ نماز کی حقیقت



میں داخل نہیں جانتی۔ اسی طرح اور اور نماز میں بھی اختلاف ہے۔  
 اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مسلک کے مطابق قرآن مجید  
 سے صراحتاً یا اشارتاً پانچ نمازوں کا جمیل ثبوت دیں اور عملی تفصیل  
 کو اسوہ حسنہ و سنت نبویہؐ پر حوالہ کریں۔

۱۔ اتم الصلوة طرفی النهار

۲۔ من بعد صلوة العشاء

۳۔ اتم الصلوة لدلوك الشمس

۴۔ من قبل صلوة الفجر

ترجمہ :

۱۔ دن کی دونوں طرف نماز پڑھا کرو۔

۲۔ تمہارے غلام عشاء کی نماز کے بعد اذان لے کر تمہارے گھر میں یا  
 کہیں۔

۳۔ سورج ڈھلنے کے وقت نماز پڑھا کرو

۴۔ فجر کی نماز سے پہلے۔

ان آیات میں چار نمازوں کا صاف نام کے ساتھ ذکر ہے صلوة

الفجر، صلوة ظہر (لدلوك الشمس)، صلوة مغرب

دن کی دوسری طرف صلوة العشاء اب غور طلب بات یہ ہے



کہ چار کے عدویں درمیان نہیں ہوتا۔ اس لیے آیت  
حَافِظُوا عَلٰی الصَّلٰوٰةِ وَالصَّلٰوٰةِ الْوَسْطٰی

(سب نمازوں پر حفاظت کرو خاص کر درمیانی پر)

میں درمیانی نماز کا ذکر ثابت ہوتا ہے کہ کل نمازیں پانچ ہیں صبح

ظہر عصر اور میانی اور مغرب اور عشاء

کیسی صاف تعلیم ہے مگر ناظرین حیران ہوں گے کہ جماعت

اہلقرآن جس کا اصل مقصود قرآن کی تبلیغ ہے وہ پانچ کی

بجائے تین اور دو کہتی ہے تو اس کے حق میں یہ کہنا بجا ہوگا۔

گر تو قرآن ہمیں نط خوانی!

ببری رونق مسلمانوں!

اس باری بحث کا لب لباب ملاحظہ ہو۔

۱۲

منکرین حدیث اور الحدیث

کی نزاع میں تنقیح

ہمارے ناظرین جانتے ہیں کہ عرصہ چند سال سے ایک

۱۵ الحدیث ۲۱ نومبر ۲۰۲۲ء



گردہ منکر حدیث (القرآن) اپنی راہ سے جملہ فرقہوں کے اسلام سے جدا  
 علاوہ قرآن کے حدیث نبوی کو بھی حجت جانتے ہیں اس فرقہ کو  
 اختلاف ہے۔ اہل حدیث گروہ سے تو خاص کر ٹکڑے کیونکہ  
 شروع سے اہل حدیث ہی ان کے جواب میں کھڑے ہوئے  
 خاص کر اخبار اہل حدیث کا تو دعویٰ ہے کہ  
 بلائیں زلف جاناں کی اگر لیں گے تو تم لیں گے

چونکہ اس فرقہ سے جملہ اہل اسلام کا اصولی اختلاف ہے اس  
 لیے ہم نے ان کی نزاع کی مختصر <sup>نتیجہ</sup> قائم کر کے اس فرقہ سے  
 سوال کیا تھا جس کا جواب لاہوری جماعت کے آرگن رسالہ  
 "اشاعت القرآن" میں نکلا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اپنا نتیجہ سوال  
 اور اس کا جواب سارے کا سارا نقل کر دیں تاکہ بالانصاف ناظرین  
 اندازہ لگا سکیں کہ جواب کہاں تک صحیح ہے۔ یکم ذی الحجہ ۱۳۷۲ جولائی،  
 ۱۹۲۴ء کے "اہل حدیث" میں <sup>نتیجہ</sup> مضمون نکلا تھا جو بعینہ نقل  
 ہے۔

اہل حدیث اور منکرین حدیث میں گوہرت سے مسائل میں اختلاف  
 ہے مگر ان اختلافات پر نظر ڈال کر دیکھیں تو ان کی ایک ہی بنا ملتی ہے جو  
 درحقیقت ان سب اختلافات کی جڑ ہے جس کو ثانوی اصطلاح میں



”تفہیم“ کہتے ہیں اس تفہیم کا فیصلہ جس فریق کے حق میں ہو جائے  
 وہی حق پر ہوگا۔ اور عدالتی بلکہ شرعی طریق بھی یہی ہے کہ عدلی اور  
 مدعا علیہ کے بیان سے جو امر متنازع ثابت ہو جائے وہ ”تفہیم“  
 ہوتا ہے۔ اہل قرآن (منکرین حدیث) کا بیان ہم انہی کے لفظوں  
 میں پیش کرتے ہیں۔

» بلا سخر کی اشاعت سے ہمارا مقصد وحید یہ ثابت کرنا ہے  
 کہ خدا کی مقدس کتاب قرآن مجید کے ہوتے ہوئے امت  
 مسلمہ کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں کیونکہ نہ تو خدا نے  
 قدوس نے ہی اور نہ ہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 امت مسلمہ کو کسی اور کتاب کو دستور العمل بنانے کے لیے  
 مکلف فرمایا۔

صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے کہ جو شخص بھی اس کو  
 اپنا ہادی اور راہبر یقین کرتا ہے اس کے حملہ اعراض اصولاً  
 پورا کرنے کے لیے یہ کتاب مقدس بہم وجوہ کافی  
 ہے۔

عقل سلیم تو کبھی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ کسی  
 سوسائٹی کے لیے ایک ہدایت نامہ مرتب کیا جائے



اور پھر اس ہدایت نامہ سے متعلقین کو سخت پابند بھی کیا جائے  
 کہ اسی ہدایت نامہ کو بغور پڑھنا اور حسب التحریر اس پر عمل  
 کرنا لیکن وہ ہدایت نامہ مجمل رکھا جائے اندراں عاست  
 کہ اس ہدایت نامہ کے مصنف کو حکیم و علیم بھی مانا جائے  
 ہمارے خیال میں ایسے ہدایت نامہ کو مجمل کہنا سراسر دھوکا  
 دینا ہے یا اپنی غلطی کیونکہ ایسی بات یا معافی اس ہدایت  
 نامہ کے مطالعہ سے ہرگز ہرگز نہیں پائے جاتے جس سے  
 ثابت ہو کہ مجمل یا نامکمل ہے چنانچہ اس مقدس ہدایت نامہ  
 میں اس کی تفصیل اور صراحت کے متعلق جو کچھ مرقوم  
 ہے وہ حسب ذیل ہے۔

وَلَقَدْ جَنَّبَهُمْ بِكَيْتَابٍ فَصَلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى  
 وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (پا ۸ : ۱۳)

اور ہم نے تو ان کو قرآن پہنچا دیا سمجھ بوجھ کر اس میں ہر طرح کی  
 تفصیل بھی کر دی۔ ایمان والے لوگوں کے حق میں ہدایت  
 اور رحمت ہے۔

الذِّكْرِ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ  
 حَكِيمٍ خَبِيرٍ (پا ۱۱ : ۱۷)



”المراد یہ ایسی کتاب ہے (جو) حکمت والے بانجہر خدا کی طرف سے،  
 نازل ہوئی ہے، اس کے مشنایین مستحکم اور پھر خوب تفصیل کے  
 ساتھ بیان کیے ہیں۔“

مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي

بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى

وَسَرَاحَةً لِّلْقَوْمِ الْيٰثِمِينَ (پ ۱۳ : ۶)

”بگور آسمانی کتابیں، اس کے نزول سے پہلے موجود  
 ہیں ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں ان لوگوں کے لیے جو  
 ایمان دالے ہیں ہر چیز کا تفصیلی بیان اور ہدایت اور رحمت

ہے۔“

كِتَابٌ فَصَّلْتُ آيَتَهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ

يَعْلَمُونَ (پ ۲۲ : ۱۵)

”یہ کتاب ہے جس کی باتیں زبان عربی میں سمجھ وار لوگوں کے لیے  
 تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔“

آیاتِ بالا کسی تفسیر یا وضاحت کی محتاج نہیں۔ بیان  
 صاف ساہ اور ہر ایک عالم اور جاہل کی سمجھ کے موافق ہے  
 کہ خدا کی کتاب میں جو اوامر و نواہی و دیگر ارشاد ہیں خوب



تفصیل اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے  
 ہیں اور کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت بھی ہے۔  
 ”بلاغ“ ص ۳۳، ۳۴، ۳۵

اہل حدیث کا جواب دعویٰ:

ہم منکرین حدیث کے اس بیان کو کہ  
 ”اوامر و نواہی یعنی احکام شرعیہ، خوب تفصیل اور نہایت  
 شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔“  
 محتاج ثبوت جانتے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ احکام شرعیہ  
 کو انہی لفظوں میں مفصل اور شرح قرآن میں ثابت نہ کریں ان  
 کا دعویٰ ناقلاً قبول ہوگا پس ان کا فرض ہے کہ پہلے احکام شرعیہ  
 کی فہرست بناویں پھر ان کی تفصیل اور شرح سنائیں۔ اپنی فرستہ احکام  
 ہم پیش کرتے ہیں۔ منظور ہو تو نعم الا اتفاق اس میں اختلاف ہو تو  
 اظہار ضروری۔

مثلاً نماز۔ زکوٰۃ۔ روزہ۔ حج۔ خراج اراضی۔ اطاعت

امیر۔ قوانین تعزیرات وغیرہ۔

سب سے مقدم نماز ہے۔ دیگر احکام بھی ضروری ہیں پس  
 اسی ترتیب سے احکام شرعیہ کی تفصیل سنائیں ورنہ کہا جائیگا:



لَمْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝  
 نگفتے تدارو کسے با تو کار!  
 لیکن چو گفتمی و لیش بیار

اھلحدیث:

مناسب بلکہ ضروری تھا کہ اس کے جواب میں سب سے پہلے  
 امرتسری رسالہ "بلاغ" پیش ہوتا جو مخاطب اول تھا۔ خدا جانے کیوں  
 خاموش رہا۔ اس کی وجہ وہی جانے سے ہم تو یہ سمجھتے ہیں  
 بے خودی بے سبب نہیں غالب  
 کچھ تو ہے جس کی پر وہ داری ہے

جس کے "بلاغ" کے لاہوری اشاعت القرآن بولا اور خوب بولا۔  
 اچھا بولا، چٹا پتہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"ناظرین! فقیر نے اپنے رسالہ اشاعت القرآن بابت ماہ اپریل  
 کے صفحہ میں لکھا تھا کہ اگر اسلامی فرقوں کے علماء اور مشائخ صحابہ  
 کے خیال میں قرآن میں تعبیر اور تشابہ اور صامت یعنی گونگا ہے  
 تو قرآن مجید کی کوئی ایک آیت ہی ایسی پیش کر دو کہ جس کی حسب وعدہ  
 احسن تفسیراً اللہ نے تفسیر اور تشریح نہ کی ہو اور صحاح ستہ اور  
 صحاح اربعہ اور کتب صوفیہ یا ائمہ مجتہدین یا مرزا قادیانی صاحب



نے اس کی تفسیر کر کے اس کے اجمال اور ابہام کو رفع کیا ہو۔ مگر  
 آج تک علامہ وایتی مولوی ثنا اللہ امرتسری اور مرزا محمود قادیانی اور مولوی  
 محمد علی صاحب اور خواجہ کمال الدین صاحب لاہوری اور دیوبندی علماء  
 احناف اور سید علی الحائری صاحب شیبلی اور اوڈیٹر اخبار القاسم  
 وغیرہ نے کبھی قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کی کہ وہ ہمیں اس امر کا  
 ثبوت دیں کہ فلاں آیت قرآن ہمیں کی جھیل اور صامت ہے۔ اور  
 اس کی تفسیر کسی نے خارج از قرآن کر کے اس کے اجمال کو  
 رفع کیا ہے۔

داشاعت القرآن ۱۵ اگست

اہلحدیث:

ص ۱۱۲

داشاعت القرآن نے "اہلحدیث" کا مضمون خود نقل کیا  
 ہے۔ نقل کر کے یہ جواب دینا اور مثال پوچھنا کس قدر حیرت انگیز  
 ہے کیا سچ ہے؟

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور! کب تک!  
 ہم کہیں گے حمالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا؟  
 اسی جناب! انسان سب کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر خدا  
 کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ کیا آپ نے "اہلحدیث" کے مضمون



میں جہاں آیات کی مثالیں نہیں دیکھیں۔ اگر نہیں دیکھیں تو ہم آپ کو آپ کے اسی پرچہ (مورخہ ۵ اراگست) صفحہ ۴۴ کی سطر چار پر تو جہاں لکھا ہے جہاں آپ نے ہمارا مضمون نقل کیا ہے چنانچہ وہ الفاظ یہ ہیں:

”مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، شراج، وغیرہ“

کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ ان احکام کے متعلق جو آیات قرآن مجید میں ہیں ان کی تفصیل اور تشریح قرآن مجید سے دکھائے؟ اگر تھا اور آپ نے یہ فرض ادا کیا تو ان کا حوالہ دیکھیے اور اگر ادا نہیں کیا تو ہر بانی کے اب کر دیجیے۔

ہاں ہم آپ کو اجازت دیتے ہیں کہ آپ اپنے دوسرے گجراتوالی اور امرتسری بھائیوں کو بھی ملاکر صلاح مشورہ سے جواب دیجیے۔

وَادْعُوا لِمَنْ كَفَرَ مِنَ دِينِ اللَّهِ إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ  
 ناظرین! جہاں جہاں آپ لوگوں کو اس فرقہ (شکرہ) سے ملاپ ہے۔ لاہور میں ہو یا چکڑالہ میں۔ پنجاب میں ہو یا بنگال میں سب جگہ ان سے اس مضمون کا جواب طلب کریں تاکہ بتا سکیں کہ یہ سب ایک طرف ثابت ہوئے

بس اک نگاہ پر پتھر ہے فیصلہ دل کا



قاریین کرام منکرین حدیث کا آج بھی یہی دستور ہے کہ وہ اپنے ہر سوال کا جواب پاکر  
 بھی سوال کو دہراتے جانتے ہیں گے اور فیصلہ کن بحث سے قطع نظر کر کے نئے سوالات  
 چھیڑ دیں گے ایک نمونہ مزید ملاحظہ ہو۔

## ۱۳ اہل تشران کی حرکت مذہبی

گرتو قرآن بریں نہط خوانی !  
 بری رونق سلمانی !

ہمارے ناظرین آگاہ ہوں گے کہ جماعت منکر حدیث اہل تشران  
 کا اصل مرکز پنجاب میں لاہور ہے جہاں مولوی عبداللہ چکڑالوی  
 موضع چکڑالہ ضلع میانوالی (پنجاب) سے آکر چندے مسجد چنیا نوالی  
 میں مقیم ہوئے۔ وہاں میاں محمد چٹو وغیرہ ان کے معتقد بنے بعد  
 ازاں میاں محمد چٹو نے ایک مکان اس فرقہ کی مسجد کے لیے دیا  
 جہاں آج کل یہ لوگ نماز پڑھتے ہیں مولوی عبداللہ چکڑالوی کی وجہ  
 سے اس فرقہ کا نام چکڑالوی مشہور ہوا۔ مولوی چکڑالوی کے مرنے  
 کے بعد بقول ۷

۷ اہم حدیث ۲۷ مارچ ۱۹۲۵ء



آکے سجاوہ نشیں قسین ہوا میر نوبہ  
 مولوی حشمت علی پنجابی دہلی سے آکر لاہور میں مولوی چکریٹ الوی کے  
 قائم مقام ہونے لگے لیکن انصاف یہ ہے کہ مولوی عہد الشکر کو علوم  
 اصول معقول نہیں جانتے تھے مگر علوم صرف و نحو میں پنجاب پول  
 کی طرح اچھی دسترس رکھتے تھے۔ برخلاف اس کے مولوی حشمت  
 علی خیر سے ہیں جن پر یہ شعر بالکل صادق آتا ہے  
 اگرچہ شیخ نے ڈارھی بڑھائی سن کی سی  
 مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی  
 آپ کی کتابیت کا ثبوت آپ کی گذشتہ تحریروں سے قطع نظر جدید  
 یہ ہے کہ آپ لکھتے ہیں کہ حافظ پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے  
 پاس گیا اور حجیت حدیث کے متعلق سوال کیا۔ پیر صاحب نے  
 آیت

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ

پڑھی تو:

”فقیر حشمت علی نے عرض کی کہ اچھا فرمائیے کہ  
 ما ینتطق میں ”ما“ عام ہے یا خاص۔ آپ (پیر جماعت)  
 نے فرمایا کہ ہاں یہ ”ما“ عام ہے۔“

انشاعت القرآن دسمبر ۱۹۶۹ء



## اظہارِ لیاقت:

مقصود مولوی حسنت العلیٰ کی شکایت  
 نہیں بلکہ اظہارِ لیاقت ہے کہ آپ "ما" نافیہ کی بابت پوچھتے ہیں  
 کہ عام ہے یا خاص جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس "ما" کو  
 موصولہ سمجھتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ الحمد للہ میں واو عطف  
 کا ہے۔

خیر یہ تو ایک تمہیدی بات تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم نے  
 بار بار لکھا کہ اہل حدیث اور منکر حدیث میں تنقیح و تفریب یہ ہے کہ قرآنی

---

 ا

منکرین حدیث کسی تنقیح کی جانب دھیان دینے کے  
 حق میں نہیں ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ راقم کی کتاب  
 "انکار حدیث کے چار نقیب"







ثابت کر دو کہ جس کی تفسیر قرآن مجید میں نہ ہو اور اس کے اجمال کو  
 کسی شخصیت نے رفع کیا ہو۔ آپ نے جو نماز روزہ وغیرہ  
 کو مثالاً پیش کیا ہے۔ کیا فقیر نے آپ سے مجمل آیت طلب  
 کی تھی یا مثال۔ اپنی مصدوعی مثال کو مجمل آیت کہنا کس لغت  
 میں ہے۔ کیا آپ ایسے مندوب العقل ہو کہ آپ سے سوال  
 تو آیت اور اس کے ابہام اور اجمال کے رفع کی نسبتاً  
 اور جواب اس کی مثال سے دیتے ہوئے تھا و کہ تم اللہ تعالیٰ اور  
 اس کی مخلوق کو دھوکہ دیتے ہو۔ یا فقیر دھوکہ دے رہا ہے  
 کچھ تو خشیت اللہ سے کام لو۔ ہم کو آپ کو بجا صری رب العالمین  
 آپ کی بہتری اور خیر خواہی کے لیے صرف صراط المستقیم جو  
 نہایت بے خطر اور سیدھا اور سخت راستہ ہے اس پر چلنے  
 کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ مگر افسوس آپ صراط المستقیم پر  
 چلنے سے سخت گھبرائے اور اس سے نوکرم بھاگ رہے  
 ہیں اور اس محکم راستہ کو پرخطر ثابت کرنے کے لیے کو مثال  
 ہیں۔ اگر آپ ہم کو اپنا دشمن اور گمراہ کرنے والا یقین کر چکے  
 ہو تو یقین جانو تم سے بڑھ کر بد قسمت اور بے نصیب کون  
 ہو گا جو جان بوجھ کر اپنی ہلاکت اور گمراہی کے راستہ پر



چیلنے کو آمادہ ہے۔ آپ کا فرض تو یہ تھا کہ اگر آپ کا ایمان آیت  
اَکْبَلْتُمْ لَكُمْ دِينَكُمْ... الخ

اور دیگر آیات جن میں قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ میں تمہیں  
اور مجمل اور ذی عوج نہیں ہوں۔ ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے  
ایک آیت تحریر کرتے کہ یہ آیت مجمل اور مبہم ہے اور اس  
کا مفہوم بیان کرنے میں تمام قرآن سماکت اور صاف ستھرا  
اور گونگا ہے اور اس کے اجمال اور ابہام کو بخاری یا کسی  
اور شخصیت نے رفع کیا ہے۔ آپ نے تو آیت لکھی اور  
نہ اس کا کوئی اجمال اور ابہام ظاہر کیا اور نہ یہ بتایا کہ اس آیت  
کے اجمال اور ابہام کو قرآن مجید باوجود دعویٰ تفصیل و  
حسن تفسیر کے رفع نہ کر سکا۔ لیکن بخاری صاحب یا کسی  
اور شخصیت نے اس کو رفع کیا ہے۔ آپ نے مثالوں کو  
کیوں پیش کیا فقیر کا سوال مثالوں کی نسبت نہیں تھا بلکہ  
آیت کی نسبت ہے۔

الاشاعت القرآن بابت ماہ و سمبر

(۱۹۲۴ء ص ۱۲)

المحدیث: آغا! تلوار میان کن جنگی تو آپ نے بہت اظہار فرمائی مگر



بات کا ابتداً خبر معلوم نہ ہو کہ آخر یہ رنج کیسے ہے اور ہماری مثال میں غلطی  
کیا۔ ہاں یہ بنا دینا ضروری ہے کہ ہم شروع سے لکھتے آئے ہیں کہ

دولیس یہی ہمارے اور منکرین حدیث میں سب سے پہلی

فیصلہ کن بات ہے کہ منکرین حدیث کی جو پارٹی جیسی بھی

نماز پر طاعتی ہے اُس کا ثبوت مفصل اور مشرح قرآن مجید

سے دکھادیں۔ (۱۰۰ الحدیث ۲۳۳ ذیقعدہ

مطابق ۲۷ جون ۱۹۲۲ء ص ۳۰ کا لم ۳۱)

فاطمین یا ابتدا ہی سے جب نزاع یہی ہے۔ اب جو ہم نے

مسئلہ نماز پیش کیا تو کیا جرم کیا لیکن ہمارے علا منکر حدیث کے

نزدیک باو سجان اور بلنگن میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لیے وہ ہم

پر خفا ہو رہے ہیں کہ ہم نے بجائے آیت مجملہ کے مثال کیوں پیش

کی۔ لہذا ہم جناب مدوح کی تمہیل ارشاد کرتے ہیں کہ لیجیے حضرت

آیت مجملہ یہ ہے:

اقِمُوا الصَّلَاةَ

نماز قائم کرو



اس حکم کی تعمیل جیسی کبھی آپ کرتے ہیں بعینہ قرآن مجید سے دکھا  
دیجیے کیونکہ ۵

روزِ محشر کہ جان گزار بود  
اولیں پرکشش نماز بود

---



## نیاز پوری !

نگار کے اڈیٹر نیاز فتح پوری نے جب حدیث کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا تو ان کے استدلال کی پشت پر انسا تبیکو پیڈیا بیریٹھانیکا کی ضخیم جلدیں بھی صفا آرائیں۔ ان کی کتاب میں دیرہ والوں میں مذہبی استفسارات کے جوابات دیتے وقت یوکے کی یہ "الہامی" کتاب بڑی فراخ دلی کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ وہ ہر ظاہر حدیث کے مخالف نظر آتے ہیں جیسا کہ انہوں نے بار بار ظاہر کیا ہے۔ لیکن اس مخالفت کے پس پردہ فی الواقعہ بین السلام سے پیراری کا شدید جذبہ موجود ہے۔ جو انہیں بے چین کیے ہوئے ہے اور وہ دین کے جملہ مسلمات کو ایک قلم غیر ضروری، غیر اصلی، غیر حقیقی اور اسرار پیل روایات کی صدائے بازگشت قرار دیتے ہیں۔ ان سے پہلے کے منکرین حدیث کا خطاب زیادہ تر اپنے وقت کے علماء سے تھا جو ان کے ہر وار کا جواب برابر کے ہتھیاروں سے دیتے تھے اور اس طرح منکرین عالم اسلام میں جو انتشار پھیلنا چاہتے تھے، اس پر کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر نیاز صاحب کا حلقہ خطاب علماء سے بڑھ کر جدید تعلیم یافتہ حضرات تک پھیلا ہوا ہے۔ کالجوں کے طالب اور پروفیسر صاحبان خصوصیت کے ساتھ ان کے مخاطب ہیں۔ اس طرح اس زہر چکانی کے اثرات امت کے لیے زیادہ نقصان دہ ہیں اور ان دنوں لاہور کے رسالہ "طلوع اسلام" کو جو فروغ



مل رہے ہیں۔ وہ نیاز صاحب کی ان ہمسائی کا حاصل ہے جو حدیث کا خلاف ایک  
 عرصے سے جاری ہیں۔ بخروج اسلام کو ایک حد تک اپنے خیالات کی تضحیر و پڑی کے  
 لیے زمین تیار ملی ہے۔ اس لیے اس کی آواز میں سابقہ منکرین حدیث سے کہیں  
 بڑھ کر شدت اور تیز آواز ہے تاہم ان کے پیشوا یا ان طریقہ نے حملہ کا جو طریقہ  
 سے چالیس سال قبل اختیار کیا تھا۔ وہ اسی پر سختی سے گامزن ہیں اور پوری پوری  
 احتیاط اس امر کی کیا ہے کہ کھل کر جناب رسالت آپ صلی اللہ علیہ وسلم  
 کی مخالفت نہ کی جائے بلکہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو حضور کا پیرو بتایا جائے  
 اور پس پر وہ حقہ کے دین کی ایسی تشریح اور ترویج کی جائے کہ ابلیس بھی کان  
 پکڑے۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں:

”جس وقت آپ غور کریں گے کہ روایت حدیث کی ابتدا کب سے ہوئی تو آپ  
 کو ماننا پڑے گا کہ یہ زمانہ وہ تھا جب رسول اللہ کی وفات کے بعد اسلام کا  
 واثر و اثر وسیع ہوتا جا رہا تھا اور اس کی سلطنت و حکومت پھیلتی جا رہی تھی۔  
 مسیحی مذہب کے پیرو اور عیسوی مسلمان کے متبعین، فلسفہ یونان کے ماننے  
 والے سامران کے آتش پرست اور بد مذہب اسکے تارک الدنیا لوگ، سبھی  
 مسلمانوں کو دیکھ کر ڈرتے تھے اور ان سب کے گمراہ و اخلاق، مذہب و اعتقاد  
 کے مقابلے میں ان کو اسلام کا مطالعہ کرنا اور شریعت اسلامی کا منضبط کرنا ضروری

تھا۔ . . . .







یہ تو تمام کتب و احادیث کو سامنے رکھ کر از سر نو جدید و عجیب تفسیر کے لحاظ سے پوری طرح دیکھ کر دیکھا جائے اور واقعی جو احادیث رسول کی ہوں انہیں منہجین رکھ کر باقی کو نظر انداز کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے (اور یقیناً ممکن نہیں ہے) کیونکہ ہمارے یہاں کئی علماء کو نیز اس کا صدیقہ ہے نہ ضرورتاً تو یہ محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مخالف احادیث سے بالکل غور ہو کر کیا جائے۔

ہم..... پھر چونکہ احادیث اسی قسم کی مختلف عقلی باتوں سے بھری پڑی ہیں اس لیے اب وہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ یا تو انہیں رسول اللہ سے منسوب کر کے رسول اللہ کی توہین کیجیے یا احادیث سے قطع نظر کر کے منکر بخاری ہونے کا الزام گزارا فرمائیے۔ میں چونکہ رسول اللہ کی ذات گرامی کو بخاری وغیرہ سے رفع سمجھتا ہوں اس لیے ظاہر ہے کہ میں احادیث کا قائل کیوں کہ ہو سکتا ہوں۔  
 ۵۔ ”آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ان جاہل مولویوں اور کم عقل داعیوں نے اسلام کو کس طرح بدنام کیا ہے ادا ان کی گندہ تصانیف نے باقی اسلام پر کیا کیا تہمت تراشی ہے۔ ایک پل صراط پر کیا موقوف ہے۔ اور ہزاروں باتیں ایسی ہیں جن کا پتہ نہ کلام پاک میں ہے اور تعلیمات اسلامی میں لیکن آج وہ مسلمانوں کے نہایت اہم عقائد میں شامل نظر آتی ہیں۔“

۱۔ من ہیرواں حصہ دوم ص ۳۳۷-۳۵۰ ۲۔ ایضاً ایضاً ص ۳۴۲



ان اقتباسات کا حاصل یہ ہے کہ حضورؐ کی رحلت کے بعد دوسرے مذاہب سے واسطہ پڑنے پر روایت حدیث کی ابتداء ہوئی صحابہ کے عہد میں ایک دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے صحابہ نے جھوٹی حدیثیں وضع کیں۔ عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس میں تو اس کام کے لیے وسیع پیمانے پر ٹکسالیں بنائی گئیں۔ احادیث میں اہم ترین مسائل میں بھی اختلاف ہے۔ لہذا اگر کوئی بھی احادیث پر عمل کرے تو وہ بیک وقت کافر بھی ہو سکتا ہے اور مسلمان بھی۔ یہ اعتراضات نئے نہیں ہیں۔ بنکرین حدیث ان پر ربع صدی سے قبل پیرا ہیں۔ بلاغ و سہر ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صادق علی کپور تھلوی نے لکھا ہے کہ:

”رسول کویم کے بعد صحابہ اور تابعین کے زمانے نہایت تاریک تھے۔ ان میں میک وید کا انڈیا ذکر مشکل تھا۔ اسی لیے کوئی عالم صحابہ کے زمانہ کے منافقوں کی اور تابعین کے زمانہ کے منافقوں کی تعداد اور نام نہیں بتا سکا“ ص ۱۰

اس پر اہل حدیث نے بدیں الفاظ تنقید کی تھی:

دو خدا کی شان حدیث سے انکار کر کے نوبت کہاں تک پہنچی ہے کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ کو تاریک زمانہ کہنے لگ گئے۔ کیونکہ منافقوں کی تعداد معلوم نہیں ہو سکی کیا اس کا جواب یہ نہیں جو امام شافعیؒ نے عرضہ ہوا ہے چکے کہ منافق زمانہ رسالت میں تھے۔ اس کے بعد اسلام ہے یا کھلا کفر، ڈاکٹر صاحب نے کہا کیا اس غلط اصول پر یہ نتیجہ نکالا کہ اس لیے ایسی حدیثیں:



خیر القرین قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم (الحدیث)  
 بالکل خلاف واقعہ ہونے کے سبب بالکل غلط ہیں۔ رسول کریمؐ کا زمانہ بھی کفر و ضلالت  
 کی شب تار یک تھا لیکن اس میں قرآن نازل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح نمایاں  
 ہو گئی، ص ۱۔

خدائی تصرف۔ حدیث مرقوم کو غلط قرار دے کر جس میں زمانہ رسالت کو بھی  
 خیر فرمایا ہے، اخیر میں ڈاکٹر صاحب خود ہی زمانہ رسالت کو صبح نمایاں قرار دیتے  
 ہیں پھر اس کے خیر ہونے میں کیا شک؟ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک صحیح حدیث  
 وہ ہے جو قرآن شریف کے مطابق ہو۔ لیجئے قرآن شریف میں ارشاد ہے:

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء  
 بینہم تراہم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً سیما

فی وجوہہم من اثر السجود

یہ آیت آنحضرتؐ اور صحابہؓ کی کمال ایمان داری، پارسائی بتا رہی ہے۔ اسی آیت  
 کی بنا پر حدیث مذکورہ میں اگر زمانہ صحابہؓ کو خیر کہا گیا تو حدیث غلط ہوئی یا اس  
 آیت کی موافقت میں صحیح "ص ۲-۲۵، جنوری ۱۹۲۹ء۔

علامہ نیاز جی کے ان الزامات کے جوابات میں ہم اسی محمولہ بالا آیت پر اکتفا  
 کیے تھے ہیں اور ناظرین بالانصاف پر یہ فیصلہ چھوڑنے سے ہیں کہ صحابہؓ کے عہد کو دروغ  
 گوئی کا دور اقل قرار دینا قرآن کے خلاف ہے یا موافق۔



علامہ جی کے ارشادات میں یہ فقرے قابل تشریح ہیں کہ "بعض لوگ خود امر اور  
 کہہ پا سنا جاکر کہا کرتے تھے کہ اگر کسی حدیث کی ضرورت ہو تو تمہیں یاد کر دینی جائے بہت  
 خوب اس کے ساتھ چونکہ حدیث روایت کرنے والوں کی سوسائٹی میں بہت حد تک  
 کی جاتی تھی اس لیے ان میں بالخصوص بھی اس طرف رغبت پیدا ہوئی۔"

بندہ پروردگار جو لوگ جھوٹی حدیثیں تیار کرنے پر اتنے آمادہ ہوں کہ امر اور  
 پرہیز جاکر فرمائش کا تقاضا کریں ان کے بارے میں یہ ارشاد ان کی سوسائٹی میں بہت  
 عزت کی جاتی تھی اور ست نہیں ہو سکتا جھوٹ کا کاروبار کرنے والے کبھی کسی  
 سوسائٹی میں بہت عزت کے مالک نہیں ہو کر رہتے۔

یہ سارا زور بیان اس لیے ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو دین کے ان خد  
 گاروں سے (جنہوں نے قصر سلطانی کے گنبدوں پر کبھی بسیرا نہیں کیا) بدظن کر دیا  
 جائے۔ اور یوں ان کی مساعی جیلہ سے روگردانی اتنی عام ہو جائے کہ ان صحت  
 امت اور آئمہ شریعت کا نام سنتے ہی یورپ پسند و راہل نظر اکھلم کھلبے زاری  
 کا اظہار کرنے لگ پڑیں۔ اس کے بعد دین کا پوسٹ مارٹم جس طرح جی چاہے  
 کر لیا کریں۔

بیان صاحب نے جھوٹی حدیثوں کی تخلیق سے متعلق جس انسان  
 تراشی سے کام لیا ہے۔ اس کی نزدیک کے لئے ہم علمائے حق کے سلسلہ  
 عالیہ میں سے صراہی خادم ملت کی زندگی کے چند واقعات بیان کرینگے



اسی سے یہ اندازہ لگاسکتے ہیں آسانی ہوگی کہ جن علمائے حق کے نام ہمہ پیش کی نسبت سے آج زندہ ہیں۔ وہ کس پایہ کے لوگ تھے اور ان کی افتاد و طبع کیسی تھی۔ اور دین پران کی استقامت کا کیا حال تھا۔

تیسری صدی کا ابتدائی زمانہ تھا فلسفہ کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر مسئلہ کے لئے فلسفہ کے دربار سے سند لی جاتی تھی بقول مولانا ابوالکلام آزاد (مجموع) یہ وقت تھا کہ قیام سنت و دین خالص کا قیامت تک کے لئے فیصلہ ہونے والا تھا۔ اور ماموں و معتصم کے جبر و تہر اور بشیر مرہبی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جبابرہ معشرہ کے تسلط و حکومت نے علماء حق کے لئے صرف دو ہی راستے باز رکھے تھے۔ یا اصحاب بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلہ نخلق قرآن پر ایمان لاکر ہمیشہ کے لئے اس کی نفی قائم کر دیں کہ شریعت میں نہ اتنا ہی نہیں ہے جو رسول بنا گیا بلکہ اسکے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جاسکتا ہے اور سرظن کو اس میں دخل ہے ہر رائے میں قاضی و آمر نے ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے لیفعل مالینا و یختار۔ اور یا پھر قید خانے میں رہنا ہر روز کوڑوں سے پٹیا جانا... امام احمد کو قید کیا گیا۔ قید خانے میں چلے گئے۔ چار چار بوجھل بیڑیاں پاؤں میں ڈالی گئیں رہن لیں۔ اسی عالم میں







صحیحین میں اختلاف فروری مسائل میں ہے۔ ان معاملات میں ہرگز نہیں ہے جن  
 پرسی کے کافر یا مسلمان ہونے کی اساس ہو۔ علامہ جی نے یہ تاثر حدیث سے  
 بدظن کرنے کے لیے پیدا کرنا چاہا ہے۔ اقتباس ۱۱ میں از سر نو جدید معیار تنقید  
 کے لحاظ سے پیرچ کرنے کا خیال محض ایک دل لگی سے جو بعد کی دو سطروں  
 کے مطالعہ پر واضح ہو جاتی ہے۔ علماء کے ساتھ تمسخر کرنے کے بعد جب وہ یہ  
 لکھتے ہیں کہ محفوظ صورت یہ ہے کہ اسلام و اصول اسلام کا مطالعہ احادیث سے  
 بالکل علیحدہ ہو کر کیا جائے تو ان کا مافی الضمیر بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ اس کے  
 بعد خلاف عقل احادیث کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اسلام کے اس خزانہ علمی  
 کو سائنس اور عقیدات جدیدہ کے منافی قرار دیا جاسکے۔ حوالہ ۵ میں جاہل مولویوں  
 اور کم عقل دانشوروں کا ذکر خیر اس لیے نہیں ہے کہ علامہ جی بانی اسلام پر تہمت  
 تراشی کے خلاف ہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ اسلام کے خدمت گاروں کو مولوی  
 قاضی، صوفی، کم علم رجعت پسند، و قیانوسی، زاہد خشک، ملائے مکتبی کے  
 القابات سے نوازا کر ول کی بھڑاس نکالی جائے اور دین کی اعلانیہ تضحیک کا حوصلہ  
 نہ پا کر دین سے نسبت رکھنے والوں کی بیل تضحیک و توہین کی جائے۔ اس کا  
 نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ آہستہ آہستہ دین سے برکشتہ ہو جائیں گے۔ یہ صاحب  
 جن نظریات کے علمبردار ہیں وہ ان کے متدرجہ ذیل الفاظ سے عیاں ہو رہے  
 ہیں۔



اب آپ دیکھیے کہ قرآن کی ابتدا کن حالات میں ہوئی ہے۔ قبیلہ قریش میں  
ایک نہایت ہی پاکیزہ شخصہ کی وصفات کا انسان پیدا ہوا ہے اور ہوش مند بھانٹتے  
ہی اپنی قوم کو، اپنے عزیزوں کو نہایت مکروہ افعال میں مبتلا دیکھتا ہے۔ اس کا  
دل بہت کرہ تھا ہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔ وراثت کی  
تہہ لیلوں میں ساری دنیا سے کٹ کر، پہاڑ کے غاروں میں چھپ چھپ کر اس مسئلہ  
پر غور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک قرن سے زیادہ اسی حال میں گزر جاتا ہے اس  
نے اپنی زندگی کا تنہا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ وہ اپنی قوم کی اصلاح کرے گا  
ان کی بڑی عادتوں کو ان سے ترک کرے گا اور حرب سوچتے سوچتے اس کے  
جذبات میں انتہائی شدت پیدا ہو جاتی ہے تو بے اختیار وہ اپنا پیغام لگانے  
لگتا ہے۔ پھر اس پیغام کے الفاظ یقیناً اسی شخص سے کہے ہیں اور اسی زبان سے ہیں  
جو اس وقت وہ راج تھی لیکن اس کا بدیع اسلوب بیان، اس کا بڑھاپا  
جوش اور اس کا اثر نتیجہ ہے اس کیفیت کا جو اس کے دل و دماغ میں سالہا سال  
سے موجیں مار رہی تھی اور بان ٹھہر ایک چشمہ کی طرح پھوٹ نکلی۔ اس کا نام وحی  
ہے اور اس کو الہام کہتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس نے قرآن کی عبارت کو  
احادیث کی عبارت سے میسر کر دیا ہے۔ احادیث کا اکثر حصہ تو ایسا ہے کہ جو  
یکسر موضوع ہے اور تھوڑا سا حصہ جسے موضوع نہیں کہہ سکتے اس کی حالت بھی  
یہ ہے کہ اس میں وہ احادیث زیادہ ہیں جو بالمعنی روایت کی گئی ہیں اور جن میں



رسول اللہ کے الفاظ میں جو نہیں نقل کیے گئے۔ ہر قسم چند احواد پرش ایسی ہیں جن میں ہم  
رسول اللہ کے الفاظ کی جھلک پاتے ہیں۔

کلام مجید کو میں نہ کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی۔ بلکہ ایک  
انسان کا کلام جانتا ہوں اور اس مسئلہ پر میں اس سے قبل کہی جا رہی تھی کہ چپکا  
ہوں۔ کلام کا مفہوم اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتا جب تک "نطق" اس  
سے متعلق نہ ہو۔ اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا اس لیے اگر ہم  
خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے لیے نطق  
بھی لازم ہو گا جس کا تعلق یکسر ادیان سے ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی علامہ جی کو کلام نفسی اور کلام لفظی سے  
متعلق ان بحثوں کا علم ہو گا جو اسلامی مفکرین نے اس موضوع سے متعلق تجویز  
کی ہیں۔ وہ یہاں اس الجھن کی وجہ سے قرآن کو کلام الہی ماننے سے منکر نہیں  
ہیں کہ انھیں خداوند تعالیٰ کے ہاں اعطاء کا وجود ماننا پڑے گا۔ بلکہ اصل پریشانی  
صرف اتنی ہے کہ وہ سرے سے خدا ہی کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک نہ کوئی  
پیغام رسال ہے نہ پیغام ارسال کرنے والا۔ بلکہ ایک انسان حسب کافی غور و  
فکر سے کلام لیتا ہے تو ایک چشمہ کی طرح اس کے خیالات اس کے اندر سے  
پھوٹ کر باہر نکل آتے ہیں اور یہی وحی ہے اور اسی پہچان کا نام الہام ہے۔



اس اقتباس سے یہ بھی واضح ہے کہ علامہ جی کے خیال میں آنحضرت ﷺ خود ساختہ نبی تھے ان کے اندر یہ خواہش ابتدا ہی سے تھی کہ قوم کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اس خواہش نے شدت اختیار کی تو انھوں نے پیغام دینا شروع کر دیا اور خود بالمشا ایسا عقیدہ رکھنے والے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآن کو منزل من اللہ سمجھتا ہوگا خود فریبی سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نگار کا مطالعہ کرنے والے بعض حضرات نے اسی غلط فہمی کے زیر اثر علامہ جی سے مذہب کے بارے میں استفسارات کیے ہیں جن کا جوابی مجموعہ من دیو وال کی صورت میں ملجوع ہوا ہے۔

علامہ جی فرماتے ہیں:

”مگر افسوس کس قدر بے شاک امر ہے کہ قرآن کے اس طرہ افتخار کو جو قیامت تک مخالفین کے دلوں میں بھی رشک و حسد کی آگ بھڑکا رہا ہے گا حدیث نے چھین لیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک غیر ذمہ دارانہ قول نے قتل مرتد کی ایک بدعت پیدا کر دی۔ کہ کتنی جانیں اس خطرناک قول کے صدمے فنا ہوئیں کتنے لوگ اسلام ہی سے بدظن ہو گئے کتنوں نے اس کی آڑ میں اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹایا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ممالک اسلامیہ کی موجودہ پستی کی ذمہ داری صرف اسی ایک مسئلہ پر ہے۔ اگر ایک مجہول حدیث نے کچھ کمی چھوڑی تھی تو اس کی تکمیل فقہ کے ہاتھوں سے ہوئی۔“ ص ۱۲۔ نگار جون ۱۹۳۱ء



اس اعتراض کا جواب ۸ ارب ستمبر ۱۹۳۱ء کے ایلجیڈیٹ میں مولانا ثناء اللہ  
مہر حرم نے جو دیا ہے اس کا حاصل یہ ہے :

”جب مذہب ہی دونوں قوموں میں موجب محبت اور باعث عداوت  
تھا تو جو شخص ادھر سے جاتا پھر اس کے دل میں جانے سے پہلے ادھر کی عداوت  
پیدا ہو جاتی۔ اب اس میں دو باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایک ترک اسلام۔ دوم عداوت  
اہل اسلام۔ بلکہ یہ کہیے کہ در باطن ترک اسلام عداوت کی فرع ہے اور در ظاہر عداوت  
ترک اسلام کی فرع۔۔۔۔۔ لہذا جو لوگ داخل اسلام ہو کر پھر اختیار میں جا لیں  
وہ کتنی کچھ سزا کے مستحق ہوں گے۔۔۔۔۔“ ص ۳۰۔

نگار کا یہ کہنا کہ کتنی جانیں فنا ہوئیں کتنے لوگ اسلام سے بدظن ہوئے محض  
ایک افسانہ ہے تاریخ اسلام میں قتل مرتد کی وارداتیں اتنی مرگزر گز نہیں ہیں جن کا تصور و لا کہ  
علامہ جی نے قارئین کے جذبات سے اپیل کی ہے۔ علاوہ ازیں اپنے دشمنوں  
کو اس کی اڑ میں راستے سے ہٹانے کی مثال پیش کر دیتے تو ان کی باتنا و زنی  
ہو جاتی مگر وہ ایسا نہیں کر سکے۔ ان سب باتوں سے زیادہ جھوٹی بات یہ ہے کہ ممالک اسلامیہ کی  
موجودہ پستی کو صرف ہی ایک مسئلے کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے ممالک اسلامیہ میں کہاں کہاں اس پر عمل ہوتا ہے  
اور کن کن سالوں میں اس کن کن ممالک میں اسکی وجہ سے پستی آئی ہے اس کی مثال تو دی جاتی۔  
ناظرین! یہ سارا زور خطا برت اس لیے ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات  
کے اندر اپنی انصاف پسندی کے تاثرات پیدا کر کے حدیث کے ساتھ لفظ



جہول کو ٹھسکا کر سنے کے لیے میدان ہموار کیا جائے۔ ممالک اسلامی کی فہمی  
کی اصلی وجوہات چلنے والے صحابہ اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ علامہ جی  
کی تشخیص کتنی بے معنی اور نا یعنی ہے۔

ناظرین! مدیر نگار قرآن کریم انگریز ماٹھے سے انکاری ہیں حوالہ ص ۱۲۱  
اس کے باوجود جب وہ لکھتا ہے کہ قرآن مجید نے دنیا کے تمام مذاہب سے  
علحدہ یہ عجیب و غریب اصول پیش کیا تھا کہ مذہب میں کوئی جبر نہیں اور  
انسان اپنی رائے میں آزاد ہے اور اپنے ذاتی اعتقاد میں سوائے خدا کے  
کسی کا مستول اور جواب وہ نہیں ہے۔

تو ایک قاری اس سے یہ تاثر لے سکتا ہے کہ مدیر موصوف قرآن کو خدا کا  
کلام سمجھتا ہے اور وہ صرف حدیث کا شکر ہے۔

حضرات! یہ انداز بیان محض فریب دہی کے لیے ہے مدیر موصوف کا عقیدہ  
وہی ہے جو اٹھول نے دہلی اسلامیام کی تشخیص کرتے وقت بیان کیا ہے۔ یہ  
سب اس لیے ہے کہ پہلے حدیث کے قلم پر حملہ کر کے اسے مسمار کر دیا جائے  
اور اس کے بعد قرآن کی تحریف میں آسانی ہو جائے گی۔ اپنی مرضی سے اجمالی  
کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے تشریح کرنے پر قرآن ہوتے ہوتے بھی نہ ہونے  
کے برابر ہو جائے گا۔ قرآن کے متعلق ان کے نظریات کا ایک نمونہ اور ملاحظہ



کے لیے اس کا کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاہم یہ سب ثابت نہیں رکھتا۔ اور تم  
 اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جاسکتا ہے۔ یہ شہد نبوی ہیں  
 اس قسم کی روایتیں تورات اور انجیل کے حوالے سے لوگوں کو سمجھانے اور قرآن  
 کے لیے یہود و نصاریٰ کی طرف سے نام طوریہ بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ  
 تورات اور انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا اس  
 لیے رسول اللہ نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور  
 اس سے کوئی بحث نہیں کی کہ یہ صحیح ہیں یا غلط۔  
 اسی عقیدے کو ۱۲ پر دوبارہ بیان کیا گیا ہے ہم ان سطور کا خلاصہ  
 نمبر وار درج کرتے ہیں۔

- ۱۔ قرآن میں جو قصے بیان ہوئے وہ بقول نیاز صاحب غلط ہیں۔
- ۲۔ تورات اور انجیل کو الہامی کتابیں سمجھنا غلط خیال ہے۔
- ۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غلط قصوں کو ان کی صورت یا یا عدم صحت کی  
 پر تالی کیے بغیر قرآن میں درج کر دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔
- گو یا کہ رسول کے پاس کسی واقعہ کو پرکھنے کے لیے کوئی غیبی ذریعہ نہیں  
 تھا۔ ان کا کام صرف سمجھانا تھا چاہے اس کے لیے جیسے جیسے قصے ہی



سننے پڑھیں

تاریخ کرام اب آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس علامہ کے یہ نظریات ہوں اس کے دل میں رسول اللہ کی کیا قدر و منزلت ہوگی اور اس کے باوجود وہ آپ کو رسول اللہ کہتا ہو تو اس نسبت در رسالت اس کے اظہار میں وہ کس حد تک خلوص سے کام لے رہا ہوگا جو شخص سچے اور جھوٹے ہیں تمیز نہ کر سکے۔ وہ اللہ کا رسول کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ سب کس لیے ہے!

اسی لیے کہ علامہ نیاز صاحب نہ خدا کے قائل ہیں نہ رسالت کے۔ وہ اپنے اصلی عقیدے کا اظہار رسالت صاف کرتے ہیں تو ایک طرف ان کی مخالفت زیادہ ہوتی ہے اور دوسری طرف ان کی سنتا کون ہے۔ لہذا پہلے وہ رسول کی احادیث پر حملہ کرتے ہیں اس جملے میں وہ مسلمانوں کے دفاع کا اندازہ کر پائیں گے جس طرح کہ کسی ملک کی جنگی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے سرحدی جھڑپوں کی جاتی ہیں یعنی حسب حدیث پر حملہ برداشت کر لیا گیا تو وہ پوری قوت کے ساتھ قرآن اور قرآن کے نظام پر حملہ آور ہوں گے۔ ان علامہ جی کے مبلغ علم و عرفان کے ان چند حوالوں کے بعد ہم پاکستان کے ایک بہت بڑے علامہ غلام احمد پرویز مدیر طلوع اسلام لاہور کے چند ارشادات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ دیکھیے ان بزرگواروں کے مزاج



اور افتادِ طبع کی تعمیر میں جو عناصر رابعہ کار فرما ہیں ان کے خدو و خال آپس میں کس و رجبہ ہم رنگ ہیں۔

آپ و دظہورِ اسلام کا مسلک "کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

ظہورِ اسلام جس مسلک کو ایک عرصے سے پیش کر رہا ہے وہ مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ لہذا صحیح اسلامی نظام یہ ہے کہ ہم دہم سے مراد ہے ہر دور کے مسلمانوں کی ہیبت اجتماعیہ (قرآن کریم کو اپنے نظام کا محور قرار دیں اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات متعین کریں۔ ان جزئیات کے تعین میں ہم ان کوششوں کو بھی سامنے رکھیں گے جو اس سے پہلے اسی نہج و اسلوب پر ہوتی رہی ہیں۔ ان میں جو چیزیں ایسی ہوں گی جن میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے گا۔ دوسروں میں مناسب تبدیلیاں کر لی جائیں گی اور نئے امور کے نئے فیصلے کیے جائیں گے اور اس ساری کوشش کی اصل دنیاویہ ہوگی کہ کوئی نئے قرآن کریم کے اصول سے نہ ہٹے۔ یہ ہے اسلامی نظام کی صحیح روح۔ یہی رسول اللہ نے کیا تھا۔ اسی کے مطابق اس خلافت کے دور میں عمل رہا جو علیؑ منہج النبوت قائم تھی اور اسی کے مطابق پھر سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے (قرآنی دستاویز پاکستان ص ۱۱۲)۔ اس اصول سے جو جزئیات متفرع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔



۱۔ دین یعنی اسلامی نظام کا اصل الاصل قرآن ہے۔ قرآن کے معانی واضح  
اس کی عبارت صاف اور سلجھی ہوئی اور اس کی تعلیم کھل کھلی اور نکھری  
ہوتی ہے۔

۲۔ قرآن نے بالعموم دین کے اصول دیے ہیں۔ ان اصولوں کی جو چیزیں  
اسلامی نظام حکومت اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود  
منتخب کرے گا۔

۳۔ سب سے پہلے ان چیزیں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منتخب فرمایا جنہوں کے  
بعد حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے ان چیزیں میں جن کے متعلق  
ضرورت سمجھی گئی۔ مناسب رد و بدل ہوتا رہا اور جن میں کسی تبدیلی کی کوئی  
ضرورت نہ سمجھی گئی انہیں علی علیہ السلام رہنے دیا گیا۔

۴۔ جو نئے امور پیش آئے ان کے لیے نئی چیزیں منتخب کی گئیں۔

۵۔ آج جو اسلامی مملکت علی مرتضیٰ علیہ السلام قائم ہوگی اسے بھی یہی چھوڑنا  
ہوگا۔

مطلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ جن احکام کو قرآن کریم نے صرف اصولاً  
بیان کیا ہے اور ان کی چیزیں کا تعین نہیں کیا۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے والستہ  
اسی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اگر نشانے خداوندی یہ ہوتا کہ ان کی چیزیں بھی



ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں تو قرآن کریم میں ان جزئیات کو بھی خود ہی متعین کر دیا جاتا ہے۔

قرآن کی تعلیم بالکل صاف اور واضح ہے۔ وہ اپنے مفہوم کے تعین کے لیے کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں۔ نہ تفسیر کا اور احادیث کے ذخیروں کا۔

• احادیث کے متعلق طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر وحی نازل ہوئی۔ وہ سب قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ رسول اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ حضور کے اپنے ارشادات تھے۔ کلام اللہ نہیں تھا۔

• طلوع اسلام بھی یہی کہتا ہے کہ ہم احادیث کے مجموعوں کے متعلق تقنین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ جن چیزوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل رسول اللہ کی ہیں۔ اس لیے یہ چیزیں دین کا مدار قرار نہیں پاسکتیں۔ کیونکہ دین کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا کہ اسے لایب فیہ ہونا چاہیے۔

• طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کہ کونسی چیز شرعی ہے اور کونسی شرعی نہیں صرف مسلمانوں کا اسلامی نظام کہہ سکتا ہے۔

۱۷ مزاج شناس رسول ص ۲۲۶ ۱۸ ایضاً ص ۲۲۹

۱۹ ایضاً ص ۲۳۸ ۲۰ علامہ جی کو صرف لایب نگھنا چاہیے تھا۔

۲۱ مزاج شناس رسول ص ۲۳۱ ۲۲ ایضاً ص ۲۳۱



ہم اس مسکن کے تار و پود کا جائزہ لیں گے اور یہ کوشش کریں گے کہ اس  
 مسکن کی صحیح صورت واضح کر سکیں۔ علامہ جی اپنے آپ کو اقبال مرحوم کا پیر و قرار  
 دیتے ہیں۔ ظور اسلام میں اقبال کے اشعار کا اقتباس بکثرت موجود ہوتا ہے۔  
 علامہ جی کی اقبالی سے یہ نسبت اس لیے نہیں کہ انھیں اقبال کا مسکن پسند ہے  
 بلکہ اس لیے کہ پاکستان کے پڑھے لکھے لوگ اقبال مرحوم سے عقیدت رکھتے  
 ہیں۔ لہذا اس نسبت کے پرے میں علامہ جی اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے  
 کر رہے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباسات کا خلاصہ یہ ہے کہ :

- ۱۔ قرآن کریم کو اسلامی نظام کا محور قرار دیا جائے۔
- ۲۔ اس کے اصولوں کی روشنی میں جزئیات کا تعین ہو۔
- ۳۔ یہ تعین ہر دور کے تقاضوں کے مطابق ہو۔
- ۴۔ اس تعین کے وقت پہلے کی کوششوں کو سامنے رکھا جائے۔
- ۵۔ نئے امور کے نئے فیصلے ہوں۔
- ۶۔ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا تھا۔
- ۷۔ دور خلافت راشدہ میں اسی طرح عمل رہا۔
- ۸۔ دور خلافت راشدہ میں حضور کی مقررہ کردہ جزئیات میں رد و بدل ہوتا رہا۔
- ۹۔ اصولی احکام کی جزئیات کا تعین قرآن کریم میں اس لیے نہیں کیا گیا کہ ان جزئیات کو ابدی  
 حیثیت حاصل نہیں



۱۰۔ قرآن اپنے مفہوم کے تعین کے لیے کسی خارجی مدد کا محتاج نہیں نہ تفاسیر کا نہ احادیث کے ذخیروں کا بلکہ

۱۱۔ قرآن کے علاوہ رسول اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ حضور کے اپنے ارشادات تھے کلام اللہ نہیں تھا۔

۱۲۔ جن چیزوں کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ حضور کی ہیں بھلی یا نہیں۔

۱۳۔ شرعی اور غیر شرعی (حلال و حرام جائز و ناجائز) کا فیصلہ صرف مسلمانوں کا اسلامی نظام کر سکتا ہے۔

۱۴۔ اس لیے موجود ہیں کہ کوئی شخص قرآن کے اصولوں کو غیر واضح یا مبہم نہیں کہہ سکتا۔ اجمال اور تفصیل میں جو فرق ہے اسے باسانی نظر انداز کر کے قرآن کے جامع اور مکمل ہونے کا تصور دلا کر اس الجھن کو پیدا کیا جاسکتا ہے کہ جب قرآن خود مکمل اور واضح ہے تو احادیث کی ضرورت کیا ہے؟ مولوی عبداللہ چکری الہوی اور اس عہد کے دوسرے منکرین حدیث کا یہ پرانا طریقہ ہے جسے آج کے منکرین حدیث بھی برابر استعمال میں لارہے ہیں۔

۱۵۔ نئے تقاضوں کا ذکر اس لیے ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو بتایا جاسکے

۱۶۔ گذشتہ ادباق میں آپ نے ملاحظہ کر لیا ہے کہ صرف نماز کے حکم کی تشریح کے سوال کا جواب حدیث سے بے نیاز ہو کر منکرین نہیں دے سکے



کہ دین اسلام زمانے کے تقاضوں سے بے نیاز نہیں رہتا اور نہایت ماڈرن ہے اور جو لوگ ہمارے ہم نوا نہیں وہ ترقی کے دشمن ہیں۔ جہاں ہیں کم علم ہیں۔

(۴) سابقہ کوششوں کو سامنے رکھنا اس لیے ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ تم عہد نبویؐ کی کاوشوں کو نظر انداز کیوں کرتے ہو۔ ان کی نشانی کے لیے سابقہ کوششوں

کو بھی دوٹو دینے کا حق دیا گیا ہے۔ یہ سابقہ کوششیں کیا تھیں۔ ان کا ثبوت ان

کا بیان ان کا ریکارڈ طلب کیجئے تو جواب یہی مل سکتا ہے کہ ان کا بیان احادیث میں ہے۔ اب اگر ہمیں تک اکتفا ہوتا تو طلوع اسلام حدیث سے بہرہ مند ہونے

کا اقراری ٹھہرتا اور یہ اس کے مسلک کے خلاف ہے لہذا کہا گیا ہے "۱۲۔

حضور سے جو باتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ ان کی صحت میں شک ہے۔" چلو

سابقہ کوششوں کا بیان بھی ہو گیا اور ان سے چھٹ بھئی مل گئی۔ اب آپ نے اس کو

ملاحظہ کریں گے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ احادیث کی ضرورت نہیں بجز

ایک سوال باقی رہ ہی جاتا ہے۔ طلوع اسلام کو یہ اطلاع کہاں سے ملی کہ:

۶۔ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا تھا۔

۷۔ دور خلافت راشدہ میں اسی طرح عمل رہا۔

۸۔ دور خلافت راشدہ میں حضور کے فیصلوں میں رد و بدل بھی ہوتا رہا۔

اگر احادیث سے اور اس دور کی کتب تاریخ سے معلوم ہوا ہے تو آپ

کے نزدیک تو ان چیزوں پر یقین ہی نہیں کیا جاسکتا اب جو ان کو صحیح مان رہے



ہیں اپنے مطلب کی خاطر ایسا کر رہے ہیں اور جہاں اپنا مطلب نہیں نکلتا وہاں  
شک کو اجازت عام عطا فرماتے ہیں۔ آخر یہ دعویٰ کیوں کرتے ہیں کہ کس اصل کی  
رو سے یہ جائز ہے۔ اگر آپ کی یہ اطلاعات حدیث کے سوا کسی اور ذریعہ سے  
ہیں تو اس کا حوالہ دیجیے۔

ناظرین! سچی بات تو یہ ہے کہ ان منکرین کے نزدیک حضور کا مقام یہاں  
کسی خاص توجہ کا حق واری نہیں ہے ملاحظہ ہو "قرآن کے علاوہ رسول  
اللہ نے جو کچھ فرمایا وہ حضور کے اپنے ارشادات تھے کلام اللہ نہیں تھا"  
بندہ پروردگار آپ حضور کے اپنے ارشادات کو محض برائے نام ہی بیان کر  
رہے ہیں۔ اول تو آپ ان کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ اور اگر ان کے ایک  
اودھ خدو حال کو مانتے بھی ہیں تو اسے محض حضور کی بشری پسندیلنا پسند  
قرار دے کر دین کا جزو نہیں مانتے آپ نے کلام اللہ کو بظاہر اللہ ہی سے  
نسبت دی ہے مگر دینِ خمانہ بات وہی ہے جسے ہندوستانی علامہ نیاز  
صاحب نے کھل کر بیان کر دیا ہے کہ قرآن کو میں کلام اللہ نہیں مانتا ملاحظہ  
ہو حوالہ ص ۲۱۶

۴۔ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا تھا یعنی امور کے تعین کے لیے صحابہ سے  
مشورہ کیا تھا۔ منکرین حدیث ایک حوالہ بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں نہیں  
دے سکتے کہ بھی حضور نے دین کے کسی اصل کی جزئیات تعین کرنے میں صحابہ



سے مشورہ کیا ہو۔ اور پھر ان بشری صلاحیتوں سے دین کو بنایا ہو۔ یہ حضورؐ پر ایک بہتان ہے۔

۸۔ دور خلافت علیؓ منہاج النبوت میں حضورؐ کے کسی ایک فیصلے کو کبھی بدلا نہیں گیا۔ یہ خلفائے راشدین پر تہمت تراشی ہے۔ آخر یہ ساری تہمت تراشی کیوں ہے؟ اس کا فائدہ کیلئے؟ اس سوال کا جواب ہم دو حصوں میں بیان کرتے ہیں۔

نکتہ ۱۳ کے ملاحظہ کے بعد جواب کا حصہ اول یہ ہے کہ پاکستانی علامہ جی شرعی اور غیر شرعی امور و احکام کے تعین کا اختیار صرف مسلمانوں کے اسلامی نظام کو دے کر وقت کی حکومت اور ان ارباب اختیار کو زیر احسان کر رہے ہیں جو مملکت پاکستان میں اسلامی نظام کے رواج پا جائے تو پسند نہیں کرتے اور جن کے ذاتی اور جماعتی مفادات کو اس نظام سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

حصہ دوم یہ ہے کہ علامہ جی نے اپنے ذاتی مسک کو بیان کرتے وقت اکثر بولیں ارشاد کیا ہے۔ ”طلوع اسلام یہ کہتا ہے۔ طلوع اسلام کا یہ مسک ہے۔ طلوع اسلام یہ ہے۔“ اس انداز بیان اور اسلوب نگارش کا نشان نزول

اس مسئلہ کی تفصیلی بحث ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر ستمبر ۱۹۹۸ء۔

ص ۹۳-۹۹ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔



ذوق سلیم کو بدیں و چہ ناگوار گزرتا ہے کہ کہنے والا اپنے رسالہ کا ذکر یوں کر کرتا ہے جسے یہ کوئی الٹا ہی کتاب ہے۔ توریث میں یوں ہے۔ انجیل کا یہ حکم ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے۔ ان فقروں سے جو کہاں اور جاہلیت شکیلی ہے اس کے علاوہ کے بعد ناظرین "طلوع اسلام یہ کہتا ہے" کو بغور ملاحظہ فرمائیں گے تو ان پر یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ علامہ جی کس مقام سے "کلام پینزی" فرما رہے ہیں۔ یہ ادعا اور یہ تعلق آپس میں خطاب اس لیے ہے کہ منکر حدیث دراصل نبوت جدیدہ کا مدعی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں حضور سے کوئی عقیدت نہیں ہوتی۔ اس کی بحثوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ حضور بشر محض تھے۔ وہ عبد محض اور عبیدہ ہیں فرق نہیں کیا کرتا۔ بعض نادانی سے اپنے اس عقیدے کا اظہار کر بیٹھے ہیں اور بعض صلہ است کو شنی ہیں اسے چھپانے کی کوشش ہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ منکرین حدیث کے امام حشمت علی و صاحب کے الہام کے مطالعہ پر ثابت ہو جاتا ہے۔

مسجد بازار سر پاولہ لاہور میں چند مختلف فرقوں کے مسلمانوں کے نماز پڑھنے پر چکڑا لوی فرقہ نے ان کے خلاف سرکار میں مقدمہ دائر کیا زبردست ۱۰۶۔ ان نمازیوں کی سال بھر کے واسطے ہزار ہزار روپیہ ضمانت ہو گئی اور آئندہ اس مسجد میں مسلمانوں کی افواں نماز جماعت جمعہ حتیٰ کہ دعا و افادت مسجد تک بند۔ اسے چکڑا لویوں کے امام حشمت علی صاحب نے اپنی عداوت







جس کو ہمارے مخالف اپنا مذہبی دشمن کہتے تھے اور ہمیں بھی اس کے پاس  
فیصلہ سے جانے کی وجہ سے مخالف اپنے مصدقہی اسلام سے کافر  
بتلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اسے اُس سے وہی فیصلہ کر آیا جو بالکل سزا  
عدل اور صدق کے ماتحت تھا۔

اس کے بعد اس فیصلہ کے ترجمہ کو اپنے رسالہ میں فخریہ درج کرنے سے  
پہلے بڑے جلی حروف میں لکھا ہے۔

”اور فیصلہ یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے مطابق لکھ دیا گیا

جو ایک سلیم الفطرت انسان کی قلم سے نکلا۔“

فیصلہ جو کچھ ہوا وہ تو ناظرین اور پڑھنے والے کے ہیں اب اس فیصلہ کی نسبت چکر الہوی  
علم نے اپنے اس رسالہ کے صفحہ ۸ پر لکھا ہے۔

”ناظرین کرام! کیا آپ صداقت اور عدالت سے کہہ سکتے کہ اسلامی فرقوں

میں کوئی مولوی اور شارح اور حاکم نہیں ہے فیصلہ دے سکتا ہے جو ایک

منصف مزاج اور عادل حق پسند رائے صاحب لالہ شکر داس سٹی

مجسٹریٹ بارک اللہ نے دیا ہے؟ نہیں نہیں وہ تو وہی فیصلہ دے گا

جو سرحد میں امیر صاحب نے ایک بے جرم قرآنی قوانین سے بے خبر

کے حق میں ختم کا حکم دیا ہے۔۔۔۔۔ الخ“

یہ چند الفاظ نمونہ ہیں از رسالہ چکر الہویاں۔ اس کو پڑھ لینے کے بعد فرہ آپ وہ الہام و



وحی بھی اب پڑھ لیجیے کہ جو آپ کو فیصلہ مذکورہ بالا کے خلاف ہماری طرف سے  
اپیل دائر ہونے پر ہوا چنانچہ حکم الہی ملہم نے اپنے اسی رسالہ کے سفید نسخہ  
کو یوں سیاہ کیا ہے۔

”اطلاع مقدمہ مسجد اہل قرآن لاہور ہمارے مخالفین میں سے ایک ملہم  
نے بوکالت مسٹر محمد اکرم پیر سٹریٹ لاہور بنا را ضکی فیصلہ سٹی جسٹریٹ  
صاحب بہادر لاہور ڈسٹرکٹ صاحب بہادر کی عدالت میں اپیل کی  
ہے۔ شاید اس کی یہ مرضی ہے کہ مجھے مسجد اہل الذکر والقرآن میں  
داخلت ہے جا کرنے کی اور ہدائنی پھیلانے کی کسی طرح کوئی صورت  
پیدا ہو جائے ویدہ پاپد یفعل اللہ ما یشاء۔ و یحکم ما یرید و  
ما توفیقنا الا باللہ۔ افض امری الی اللہ“

یعنی خدا نے جو چاہا سو کیا۔ اور جیسے چاہا فیصلہ کر دیا۔ اور میں نے خدا کی  
دی ہوئی طاقت کے بغیر کچھ نہیں کیا۔ اور میرے سلسلہ کی باگ ڈور اللہ  
ہی پر ہے۔

حضرات ایہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد شہادت علی حکم الہی ملہم کے الہام  
کے تمام عنکبوتی تاویلوں کو نکھیرنے کی خاطر آپ کو ذرہ بھر بھی تکلیف اٹھانی نہیں پڑے  
گی۔ جب کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ ہڈیوں میں ۱۹۲۵ء کو پیر سٹریٹ محمد اکرم کی تقریر کو  
بغور شکر ڈسٹرکٹ جسٹریٹ نے فیصلہ آسمانی مذکورہ بالا کو ایک دم توڑ دیا اور



اہم مخالفین کی ضمانتیں منسوخ۔ اور اب مسجد منٹناز عمر میں ہر مسلمان کو اپنے اپنے طریق پر مذہبی فرائض ادا کرنے کا اذن عام ہے۔ "راہلحدیث ۲۵ اردو ستمبر ۱۹۷۱ء"

## حقیقت

اصل حقیقت یہ ہے کہ منکرین حدیث و باطن منکر رسالت ہوتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر منکر خدا ہوتے ہیں اس لیے ان کے دل میں یہ خواہش رہ رہ کر اٹھتی اور منہ برون ہوتی ہے کہ "ہم تشریح کا حقیق صرف ابن عبداللہ کو کیوں ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں۔ وہ بھی انسان تھے۔ آج علوم و فنون کی ترقی کا دور دورہ ہے۔ ہمارے سامنے علم کے حصول کے اعلیٰ ذرائع موجود ہیں۔ لہذا انسانیت کی فلاح کے لیے ہم بھی نیک مشورے دے سکتے ہیں" جب ان کے دلوں میں اس قسم کے دوسے جاگزیں ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے اہل تشیعافی القاکا نتیجہ ہیں یا ایجاد بندہ ہیں۔ ان سے جو کچھ بن آئے کرتے ہیں شیطان بعین ان کا دست اور دست راست بن جاتا ہے



اور ان کے مبلغ علم سے اس طرح کے سوالات عالم وجود میں آتے ہیں۔

۱۔ کیا رسولؐ فقہائے سوال ہے؟

۲۔ کیا رسولؐ اصل مطابح ہے؟

۳۔ اس کی شخصی حیثیت اور پیغمبرانہ حیثیت میں کیا فرق ہے؟

۴۔ کیا رسولؐ کے فیصلوں کو زمانہ کے اقتضا کے مطابق بدلا جاسکتا ہے؟

۵۔ کیا رسولؐ کے بغیر کوئی اور باختیار انسان تشریحی حیثیت رکھتا ہے؟

۶۔ رسولؐ کے فیصلے حجت ہیں یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس خواہش کے باوجود منکرین حدیث کے تمام فرقے مل کر آج تک

ذیل کے سپردے سادے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دے سکے۔ ان سے

ان کے تمام غلط و عاویٰ کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے جو وہ احکام دین کو

صرف قرآن میں محدود اور محصور (وہ بھی ایک اسکیم کے تحت) بتانے کے

یہے پیش کیا کرتے ہیں۔

سوالات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نماز کس طرح شروع کیے اور کس طرح ختم کیے۔

۲۔ کون کون سے ارکان اور کس ترتیب سے ادا کیے۔

۳۔ ہر رکن میں کیا کیا افکار پڑھے جائیں۔

۴۔ فرض نمازوں میں اختلاف رکعات کس دلیل سے ہے۔



- ۵۔ نماز کے اندر بھول چوک ہو جائے تو کیا کیا جائے۔
- ۶۔ زکوٰۃ کے متعلق استفسار ہے کہ تمام عمر میں ایک ہی دفعہ فرض ہے یا ہر سال یا ہر ششماہی یا ہر سہ ماہی وغیرہ کے بعد۔
- ۷۔ کس کس مال میں زکوٰۃ واجب ہے اور کس کس میں نہیں۔
- ۸۔ رمضان شریف میں کتنے دن تک روزہ رکھنا فرض ہے۔
- ۹۔ حج تمام عمر میں ایک ہی دفعہ فرض ہے یا ہر سال۔
- ۱۰۔ طواف بیت اللہ اور سعی صفا و مروہ کتنی مرتبہ ہونی چاہیے۔
- ۱۱۔ عرفات کے میدان میں اور مشعر الحرام میں کس دن حاضر ہونا چاہیے۔
- ۱۲۔ منیٰ میں کس دن آنا چاہیے۔
- ۱۳۔ طواف بیت اللہ اور طواف زیارت کب ہونا چاہیے۔
- ۱۴۔ احرام کی جگہ مکی اور غیر مکی کے لیے یعنی یلیقات کون کون سے ہیں۔
- ۱۵۔ قربانی عبید النہجی کا حکم اور اس کی میعاد زیادہ سے زیادہ کتنے روز تک ہے۔
- ۱۶۔ تھنہ کرانے کا حکم کہاں ہے۔
- ۱۷۔ نماز جمعہ کی کتنی رکعتیں ہیں نیز فجر اور وقت ظہر پر پڑھنے کا حکم کس آیت سے نکلتا ہے۔
- ۱۸۔ صلوٰۃ عبیدین کا حکم کہاں سے لیا گیا ہے۔
- ۱۹۔ نماز جنازہ کس طرح پڑھی جاسکتی ہے۔



۲۰۔ صدقہ عید الفطر کا کیا ثبوت ہے۔

۲۱۔ اعتکاف کیا چیز ہے اور کب ہونا چاہیے۔

۲۲۔ کھرا چیل، لومڑی، کتا، گدھا وغیرہ کس دلیل سے حرام ہیں وغیرہ وغیرہ۔

(ماخوذ از استفسارات قاضی منظور حسین، اہلحدیث ۲۱ ستمبر ۱۹۳۲ء)۔

ان سوالات کے جوابات قرآن مجید سے مطلوب ہیں۔ جو بات ایسے ہوں کہ پوچھنے

والے کو حجاب تفصیل اور تشریحات قرآن ہی سے مل جائیں اور انسانی تفسیر

تشریح، یا ایجاد بندہ کی دخل اندازی سے میرا ہوں۔

آپ دیکھیں گے کہ منکرین حدیث کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ ان

کے امام الائمہ اور ان کے اولیٰین تلامذہ نے صرف نماز اور اذان کے تعین کے

سلسلہ میں جو اٹکل پچوسے کام لیا ہے وہ ان کے ان مباحثوں سے عیاں

ہے جو ہم نے اہلحدیث امرتسر سے نقل کر کے ہدیہ ناظرین کیے ہیں۔

پندرہ سجدی کہ راہ صفت  
توان رفت جزا زپے مصطفیٰ

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۛ



# انکارِ حدیث کے چار نقیب

اسی کتاب میں

- ۱۔ نیاز فتحپوری
- ۲۔ اسلم جیراچوری
- ۳۔ برق کیمیلپوری
- ۴۔ غلام احمد پرویز ٹالوی مدیر طلوع اسلام

کی

حدیث کو مٹانے کی چالیں بے نقاب کی گئی ہیں۔ اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ منکرین حدیث کے جدید حملے کس درجہ خطرناک ہیں یہ کتاب منکرین حدیث کے ۶۰ سالوں کی تاریخ پیش کرتی ہے۔

کتابت کاغذ عمدہ، صفحات ۳۰۰ قیمت تین روپیہ۔

مکتبہ مجاہدین، نور پور شرقی گجرات



## لا بد کتب

اس کتاب میں حضرت محمدؐ و الصبیح الثانیؑ

کے مکتوبات کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بدعت دین کے لئے نہایت

ہلاک ہے۔ اور سنت نبویؐ کے عظیم الشان

محل کو ڈھانے کی ایک خطرناک سازش

ہے۔

۲۰ x ۲۵ سائز صفحات ۲۷ کاغذ عمدہ طباعت نفیس

قیمت فی کاپی مجلد ڈیڑھ روپیہ

مکتبہ جدید، نور پور شرقی، گجرات پاکستان



اقبال

اور

مشکین کا حقدار

مصنف

پروفیسر محمد فرمان ایمن اے